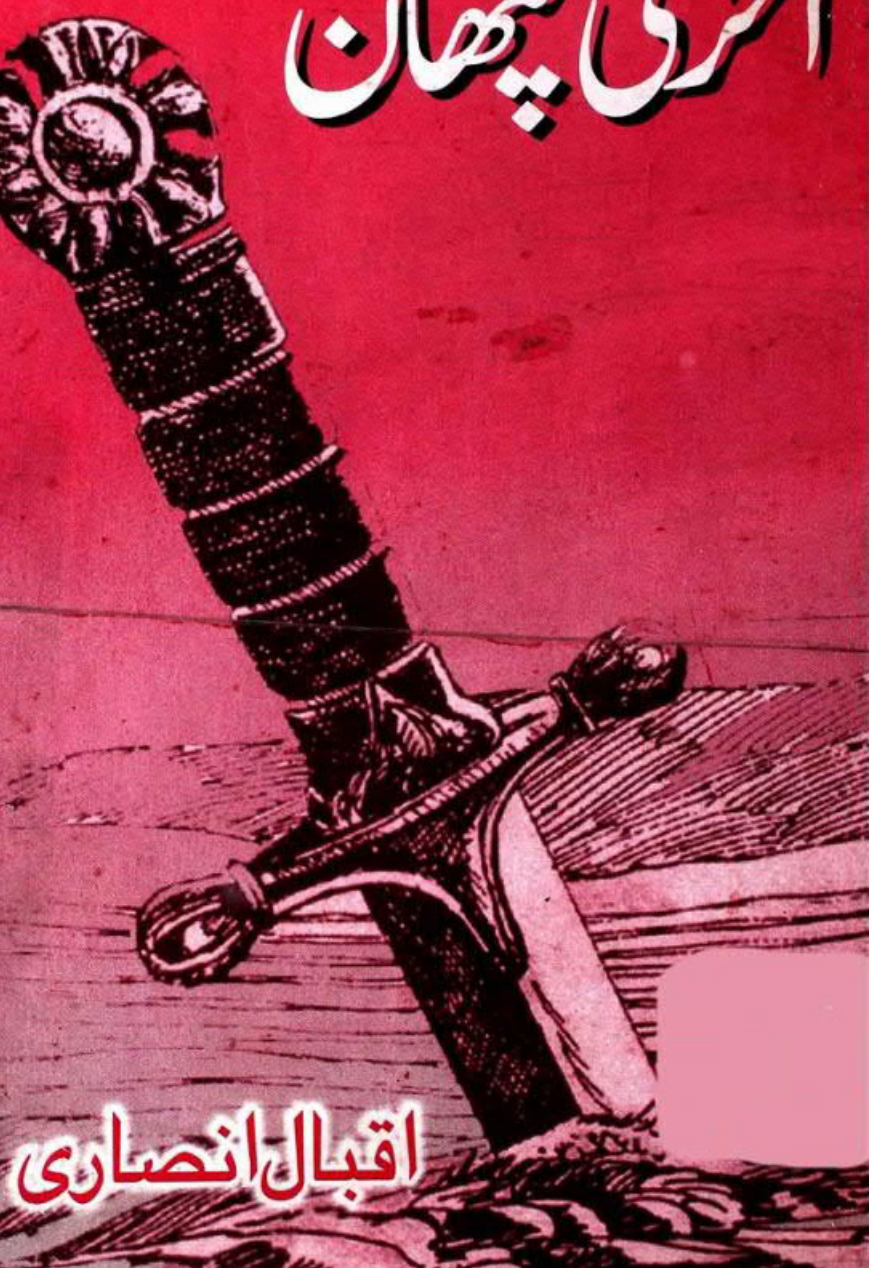


# آخری پٹھان



اقبال انصاری

# آخری پٹھان

جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ ہیں

نام کتاب : آخری پٹھان (ناول)  
مصنف : اقبال انصاری  
قیمت : ایک سو پچاس روپیہ  
سن اشاعت : 2001ء  
کمپوزنگ : رہبر کمپیوٹرز، ۲۹۳۶، کلاں مسجد، ترکمان گیٹ، دہلی۔۶  
پرنٹر : رہبر کارنر، کلاں مسجد، ترکمان گیٹ، دہلی۔۶  
پبلشر : محمد شیراز انصاری  
ایف 176، پانڈو نگر۔ دہلی 110091

---: ملنے کے پتے: ---

❖ محمد شیراز، ایف ۱۷۶، پانڈو نگر، دہلی۔۹۱

❖ رہبر کارنر، ۲۹۳۶، کلاں مسجد، ترکمان گیٹ، دہلی۔۶

اقبال انصاری

Akhri Pathan (Novel)

by: IQBAL ANSARI Rs. 150/=

نے کوئی شکایت نہیں کی..... کبھی کسی نے کوئی سوال نہیں کیا..... بھوکے رہے لیکن کسی نے روٹی نہیں مانگی..... پیاسے رہے لیکن کسی نے پانی کے لئے فریاد نہیں کی..... زخم کھائے اور منہ سے سسکی نہیں نکلی، موت آئی تو تھکے سمجھ کر قبول کر لیا۔ وہ کیسی خوش نصیب تھی کہ اسے ایسے ساتھی ملے، اور وہ سب کیسے بد نصیب تھے کہ انھیں اس جیسی رانی ملی!..... اور اب یہ گل محمد!..... ”کیا وہ واپس آئے گا؟“ اس بے رحم پتھر لیے سوال نے پھر اس کے اندر سر ابھارا..... اور پھر اس کا تھکا ہوا ذہن اور دکھا ہوا دل ایک ساتھ بولنے لگے..... ”اچھا یہی ہے کہ وہ واپس نہ آئے..... بھگوان، گل محمد واپس نہ آئے..... اس دنگی آتما کی یہ پرارتھنا سویکار کر لے کر پانڈواں..... گل محمد واپس نہ آئے..... واپس آکر وہ کرے گا کبھی کیا؟..... کیا ملے گا اسے میرے پاس؟ بھوک..... پیاس..... تھکن دور در دور بھٹکنا، گھاؤ..... کھون..... موت..... کیا ملے گا اس کے علاوہ اسے میرے پاس؟..... کیا دیا ہے میں نے اسے؟..... کیا دے سکوں گی اُسے؟..... اُس نے تو مجھے اتنا کچھ دیا ہے..... پر میں اُسے کیا دے سکی ہوں؟ دو جون کی روٹی بھی تو کبھی اسے سمنے پر نہ کھلا سکی! اکتی ابھائی میں ہوں! اچھا ہے وہ چلا گیا..... اچھا ہے کہ وہ واپس نہ آئے..... دُور چلا جائے..... بہت دور..... جہاں دور در دور بھٹکنا نہ ہو جہاں توپوں کی گرج نہ ہو، تلواروں کی جھنکار نہ ہو..... کاٹ نہ ہو..... مار نہ ہو..... جہاں کھون نہ بہے، نہ اپنوں کا نہ دوسروں کا..... جہاں لالچ نہ ہو..... سوار تھو (خود غرض) نہ ہو..... جھوٹ نہ ہو..... مکاری نہ ہو..... گمداری (غداري) نہ ہو..... جہاں کوئی اپنی دھرتی کا سودا نہ کرتا ہو..... اپنے سوا کسی چیز میں جہاں کوئی چھرا نہ گھومتا ہو..... جہاں پانچ پانچ سال تک کے بچوں کا بھی کسل (قتل) نہ ہوتا ہو..... جہاں عورتوں کو اپنے ستیو (عصمت) کی سرکشا (حفاظت) کے لئے کوئیں میں کو کر آتم تیانہ کرنی پڑتی ہو..... جہاں اپنوں کے ساتھ کوئی ایسا بھیک دھوکہ نہ کرتا ہو..... جہاں کوئی ڈلاری نہ ہو..... کوئی پانا شاہ نہ ہو..... کوئی دولا جو نہ ہو..... جہاں چھپ کر اپنوں پر چلائی

## پہلا باب

سون ریکھنا تالے کے کنارے موسری کے اُس گھنے، ہنر لیکن اُداس سے نظر آنے والے درخت کے نیچے بیٹھے بیٹھے دوپہر ہونے کو آئی..... گل محمد اب تک واپس نہیں آیا تھا۔

”واپس!“ رانی نے دل ہی دل میں دوہرایا..... اور پھر اُس کے تھکے ہوئے ذہن میں ایک سوال نے سر ابھارا..... ”کیا وہ واپس آئے گا؟“ یہ بہت اہم سوال تھا، بہت وزنی، بڑا بھاری بھر کم..... لیکن اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

پانچ لفظوں کے اس سوال سے اُس کے دل میں ایک بڑا نوکیلا درد جیسے لگا۔ اس سوال کو وہ نہ سننا چاہتی تھی، نہ اس کے جواب میں کچھ کہنا یا سننا چاہتی تھی..... لیکن چاہئے یا نہ چاہئے سے کیا ہوتا ہے..... سلگتے پتھر جیسا وہ سوال اپنی جگہ پر اپنی تمام بے دردی، اپنی کل بے رحمی کے ساتھ قائم رہا، دل میں چھینٹا رہا، نہیں پیدا کرتا رہا، ذہن میں آندھیاں ہی چلاتا رہا۔ گل محمد کا سراپا اس کی آنکھوں کے سامنے لاتا رہا..... گل محمد..... اس کا کنور گل محمد، اس کے دکھوں کا ساتھی..... ”دکھوں کا ساتھی!“

اس کے سبھی ساتھی دکھوں کے ساتھی ہی تو تھے..... اس نے سٹھ بھوکے ہیں کہاں، کہ کوئی اُس کے سٹھ کا ساتھی بھی ہوتا؟ دکھ ہی بھوگتی رہی لوگ آتے رہے اس کے دکھوں کے ساتھی بنتے رہے، خود بھی دکھ بھوگتے رہے..... کبھی کسی

جانے والی گولی نہ ہو..... جہاں جبر دستی (زبردستی) کی موت نہ ہو..... وہاں چلا جائے گل محمد جہاں جندگی اتنی کٹھن نہ ہو..... جہاں سانس لینا اتنا بھاری نہ ہو..... جہاں کوئی اس کی کدر (قدر) کر سکے..... جہاں اسے اپنی و بھاداری (وفاداری) کا مول مل سکے..... جہاں اُس کے دن صبح کی گود سے جین لے کر انھیں..... جہاں اس کی راتیں شام کے آچل سے میٹھی نیندیں لے کر ابھریں..... جہاں آج کا بد نصیب بندیل کھنڈ نہ ہو..... جہاں آج کی ابھاری جھانسی نہ ہو..... جہاں آج سے بھگانہ نہ پڑے..... جہاں آنے والے کل کی کلینا بھیانک نہ ہو..... جہاں جندگی کو اتنا ٹھکانا نہ پڑے..... بھگوان، گل محمد واپس نہ آئے..... وہاں چلا جائے جہاں..... لیکن دشواں نہیں ہو تا کہ وہ آکھری (آخری) پٹھان مرنے سے پہلے میرا ساتھ چھوڑ گیا ہو گا..... آکھری پٹھان!..... ہاں آکھری پٹھان..... پر پہلا پٹھان بھی تو وہی تھا..... جیسے و بھاداری (وفاداری) گل محمد سے شروع ہو کر گل محمد پر ہی ختم (ختم) ہو گئی ہو..... اور وہ..... جیتے جی میرا ساتھ چھوڑ گیا..... کسی گھنٹی کلینا ہے! اچھی! کوئی گل محمد جیتے جی ساتھ چھوڑنے کے لئے پیدا نہیں ہوتا۔ وہ واپس آئے گا..... چاہے مر کے ہی واپس آئے..... لیکن واپس آئے گا..... کاشی بائی ایک دن بتا رہی تھی کہ اس نے گل محمد کو اپنے لال کرتی ساتھیوں سے کہتے سنا تھا کہ پٹھان و بھا (وفا) کے لئے پیدا ہوتا ہے..... و وفا کرتے ہوئے ہی مرنے کا ہے..... ٹھیک ہی کہا تھا اس نے! اگلے گل محمد کے تمام ساتھی راحت گڑھ اور درگدرد کے وہ سارے پٹھان جیالے و بھارتے کرتے ہی مرے تھے..... کوئی کہیں چھپا نہیں تھا..... کسی نے میدان نہیں چھوڑا تھا..... کسی نے پیٹھ نہیں دکھائی تھی..... کسی نے پیٹھ پر گھاؤ نہیں کھایا تھا..... گولی کا گھاؤ رہا ہو یا تلوار کا..... ہر گھاؤ گل محمد کے تمام ساتھیوں نے سینے پر بھجھا تھا.....

اُن میں سے ہر ایک نے ہندوق یا تلوار سے ننگی بوٹی اپنی موت کو اپنی آنکھوں سے اپنی طرح (طرف) جھپٹے دیکھا تھا..... لیکن ان میں سے کوئی ایک کدم (قدم) بھی پیچھے نہیں ہٹا تھا..... جیسے وہ موت کو نہیں، جندگی کو گلے لگا رہے

ہوں..... کیسے دیوانے لوگ تھے!..... ایک ایک مگرتا گیا..... ایک ایک مر تا گیا..... جندہ (زندہ رہنے والوں نے مرتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے گھاؤں سے کھون اٹلتے دیکھا تھا..... انھیں مرتے دیکھا تھا..... لیکن وہ چمکھٹا (چمکتا) چلتا، ہانپتا، دم توڑتا کھون انھیں ہلا نہیں سکا تھا..... ان کو ڈکا نہیں سکا تھا..... ان کو ڈرا نہیں سکا تھا..... ان کے ارادوں کو بگور (بگور) نہیں کر سکا تھا..... ان کے حوصلوں کو توڑ نہیں سکا تھا..... ان کی ہمتوں کو پست نہیں کر سکا تھا..... ان کے جوش کو خنڈا نہیں کر سکا تھا..... بلکہ وہ ایسے ایک کے مرنے کے بعد اس کے جندہ ساتھیوں کے ارادے اور مجبوت (مضبوط) ہو گئے تھے..... حوصلے اور بلند ہو گئے تھے..... جوش میں اور ابال اٹھ گیا تھا..... ہمتیں اور چٹائی ہو گئی تھیں..... ایک ایک کر کے سب چلے گئے..... بلیڈان ہو گئے اسی ماتر بجوی پر..... ان میں سے کتنوں کے نام تو کھد مجھے نہیں مالم (معلوم)، اتہاس میں کبھی ان کے نام نہیں لکھے جائیں گے..... وہ اتہاس انھیں کبھی نہیں جانے گا جس کی رچنا کھد (خود) انھوں نے اپنے پر اکرم (شجاعت) سے، اپنی و بھاداری سے، اپنے لبو سے کی ہے..... وہ مر کے امر ہو گئے..... ایسے ماتر بجوی پر بلیڈان ہونے والے بہادر وہ..... ایسے اپنے لبو سے گورو و شالی (شاندار) اتہاس کی رچنا کرنے والے سور ماڈ..... تمھاری یہ ابھاری رانی تمھارے سامنے شردھا سے نت مستک ہے (عقیدت سے سر جھکائے ہے)..... تمھیں ہاتھ جوڑ کر پتہ نام کرتی ہے..... تمھاری آتما نیک مہانتا کے آکاش میں ہمیشہ ستاروں کی طرح جگمگاتی رہیں گی..... تم سواری بھگتی کا آدرش تھے..... تم دیل بھگتی کی مثال تھے..... تمھاری جندگی و حنیہ تھی..... تمھاری موت و حنیہ ہے..... تمھاری..... تم میں سے ہر ایک کی موت ہزاروں لاکھوں جندگیوں پر بھاری ہے..... بھاری رہے گی..... کاشی بائی نے ہی بتایا تھا کہ تمھارے سردار گل محمد نے تم سے کہا تھا، وطن کی کھاتر (خاطر) مرنے جندگی کا اعلا ترین پھیل (فصل) ہے..... پہاڑ کی طرح کھاموش رہنے والا تمھارا سردار سمندر کی طرح گہرا ہے..... پر وہ گیا کہاں؟..... اب تو کئی گھنٹے ہو گئے..... کہاں ہے؟..... کہاں

وگا؟ کیا واکئی (واقعی) جیتے جی ساتھ چھوڑ گیا؟..... چلو اچھا ہے..... بھوکا پیاسا  
وکی کب تک یدھ (جنگ) کرے..... اور کس آشنایں؟ بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں اس  
سوامی بھکت پٹھان نے..... بڑی چوٹیں سہی ہیں حوصلے کی اس چٹان نے..... بڑے  
مددے اٹھائے ہیں اس انسان نے..... چار سونٹانوں اپنوں کی موت جھیلی ہے اس  
سومانے..... بھگوان، اب اسے کوئی کشت نہ دینا..... ہر مصیبت سے بچانا اسے..... ہر  
دکھ سے دور رکھنا۔“

رانی نے اپنے ان چار سرداروں اپنے گودلے ہوئے بیٹے دامودر اور اپنی  
ساتھی مندر کی طرف دیکھا..... وہ لوگ کچھ فاصلے پر گولر کے ایک گھنے درخت کے  
نیچے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ان کے چہروں پر تھکن تھی، گرد تھی، بھوک  
تھی..... لیکن شکایت نہیں تھی..... بے زاری نہیں تھی..... باپوسی نہیں تھی..... کمال  
یہ تھا کہ اس در بدری کے عالم میں بھی عزم ان کے چہروں پر چھلی ہوئی ہر گرد کا پردہ  
چیر کر خود کو بڑی قوت اور بڑی شدت سے اجاگر کر رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں کوئی  
خواب نہیں چل رہا تھا..... غریب الوطنی کے اس عالم میں بھی کچھ کر گزرنے کی  
چاہت تڑپ رہی تھی..... ان میں سے کوئی بھی نامیدی کا شکار نہیں تھا..... عمل کے  
اہرن پر ان کی شخصیتوں کی تشکیل ہوئی تھی..... حوصلہ مندی ان کا مزاج  
تھی، غمیوں نے ان کی پرورش کی تھی، مصیبتیں ان کا روزمرہ تھیں، وفاداری ان کا  
کردار تھی..... وہ سب رانی کشمی ہائی کے دیوانے تھے..... جہانسی کے دیوانے  
تھے..... ہندوستان کے دیوانے تھے۔

وہاں سے کچھ فاصلے پر سات گھوڑے چر رہے تھے۔ ان میں رانی کا گھوڑا بھی  
تھا اور..... گل محمد کا گھوڑا بھی تھا۔

”کس آشنایہ یہ لوگ اب بھی میرے ساتھ ہیں؟“ ایک تھکی تھکی سی ڈھیلی  
ذہانی سانس لے کر رانی نے دل ہی دل میں جیسے خود سے سوال کیا۔ ”انھیں پتہ ہے  
کہ موت کسی بھی پل آکر انھیں دبوچ سکتی ہے..... ان کی جیون لیا کو سہاوت کر سکتی

ہے..... یہ جانتے ہیں کہ میرے ساتھ رہ کر انھیں کسی بھی سنے ایک اچانک انت کے  
نہزے میں سا جانا ہے۔ پھر بھی یہ میرا ساتھ چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں..... اگر میں  
ان سے کہوں بھی کہ میرا ساتھ چھوڑ دو، اور جس طریقہ اور جہاں تمھیں راہ  
ملے، چلے جاؤ، جیسے گل محمد چلا گیا تو بھی مجھے دشواری ہے کہ یہ مجھے چھوڑ کر نہیں  
جائیں گے، کیونکہ یہ سوامی بھکت ہیں، میرے اپنے ہیں، میری زندگی کا حصہ  
ہیں..... میرے اتہاس کا انگ ہیں..... لیکن سوامی بھکت تو گل محمد بھی ہے..... وہ بھی  
میرا اپنا ہے..... میری زندگی کا حصہ ہے..... میرے اتہاس کا انگ ہے..... پھر وہ مجھے  
چھوڑ کر..... پراچھا کیا اس نے جو چلا گیا۔ میں نے دیا ہی کیا ہے اپنے وچاداروں  
کو؟..... میں نے انھیں بھوک دی ہے..... پیاس دی ہے میں نے انھیں..... تھکن  
دی ہے..... دکھ دئے ہیں..... مصیبتیں دی ہیں..... کشت دئے ہیں..... بے گھر کیا  
ہے میں نے انھیں..... پاؤں کے چھالے دئے ہیں..... من پر بوجھ دیا ہے..... شریہ  
پر گھاؤ دئے ہیں..... موت دی ہے میں نے میرے اپنوں کو..... وہ جنھوں نے مجھے  
جنگ دی، ان کی موت کا کارن بن گئی ہوں..... کتنی در بھاگیہ شالی (بد نصیب) ہوں  
میں..... مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں گل محمد۔ تم نے اچھا کیا کہ چلے گئے..... ایشر  
کرے تمھاری مصیبتوں کا انت ہو گیا ہو..... سکھی..... رہو..... سکھی رہو..... لمبی عمر  
ملے تمھیں..... میرا آشیر واد تمھارے ساتھ ہے..... ہمیشہ رہے گا۔“

رانی کشمی ہائی نے وہیں زمین پر لیٹ کر زمین سے ابھرے ہوئے بھوہے  
رنگ کے ایک پتھر کو تکیہ بنا لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اسے اپنی زندگی سے کوئی شکوہ  
نہیں تھا..... کیوں ہو؟ زندگی نے اسے بہت سی بلندیاں عطا کی تھیں۔ یہ بات  
دوسری ہے کہ ہر بلندی کے اختتام پر ایک دل شکن دکھ نے اس کا استقبال کیا تھا۔

سے بہت زیادہ خوبصورت ہوتی تھی۔ اس زمانے کے کاشی کا آسمان نیلا..... مگر انیلا ہوتا تھا؟..... آج کے کاشی کے آسمان کی طرح مٹ میلا نہیں ہوتا تھا۔ آج کاشی ایک بھیڑ کا نام ہے۔ اس دور میں کاشی ایک من موہنی رونق ہوا کرتی تھی۔ اس دور کے کاشی کی ہوا میں تازگی ہوتی تھی..... ہاسی پن نہیں..... فضا میں نرمی ہوتی تھی..... پو جھل پن نہیں..... تب کاشی کے فلک پر چمکتے آفتاب کی تمازت بھی خوش گوار لگتی تھی..... تاگوار نہیں۔ 1835ء کا کاشی آج کے کاشی سے بہت مختلف تھا۔

1835ء کے اس سہرے کاشی میں ایک چمکیلے دن ایک بچی نے جنم لیا۔ بچی کا نام منور کھا گیا۔

منو کی زندگی کے ابھی چار ہی برس گزرے تھے کہ ماں پر لوک سدھار گئی۔ والدہ مور و پنت اسے لے کر بھور چلے آئے اور بالاجی پشیوا کے ساتھ رہنے لگے..... منو کے بچپن نے یہیں بھور میں ہی لڑکپن کی سیڑھیاں چڑھنا شروع کیا۔ اپنی ہم عمر لڑکیوں میں وہ ہمیشہ نمایاں رہی، ہمیشہ ان کی لیڈر رہی۔ دوڑ بھاگ میں شرارتوں میں ہر چیز میں وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں سے ہی نہیں ہم عمر لڑکوں سے بھی آگے تھی۔ بے حد چلبلی بھی تھی، بے حد خوبصورت بھی۔ اس کی چلبلی خوبصورتی دیکھ کر لوگ اسے پیار سے چھجیلی کہنے لگے۔ وہ بے حد ذہن بھی تھی۔ اس کی ذہانت سبھی کو متحیر کرتی رہتی تھی۔ جیسے جیسے منو بڑی ہوتی گئی ویسے ویسے اس کی خوبصورتی میں بھی اضافہ ہوتا گیا، اور ذہانت میں بھی۔ اسے دیکھنے اور جاننے والا ہر شخص یہ ضرور سوچتا تھا کہ یہ لڑکی حسین زیادہ ہے یا ذہین؟

اس کے حسن اور ذہانت میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا، لیکن اس کا حسن نہ اس کی ذہانت کو پھیکا کر سکا، نہ اس کی ذہانت اس کے حسن کو دمھم کر سکی۔ دونوں الگ الگ اپنی طاقتور پہچان بنے رہے، اور ہر صاحب بصیرت سے اپنا لوہا منواتے رہے..... خود کو منواتے رہے۔

حسن، ذہانت، نزاکت اور لڑکپن کے اس مجموعی نسوانی پیکر کے شوق بڑے

## دوسرا باب

مقدس گنگا کے کنارے پر بسا ہوا تیر تھہ استھانوں، پان اور بسم اللہ خاں کی شہنائی کا شہر کاشی ہمیشہ سے ہندوستان کے مقدس ترین مقامات میں سے ایک رہا ہے۔ اس مقدس شہر کو ”بھارس“ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے جو ”وارانسی“ کا بگڑا ہوا روپ ہے۔ ”وارانسی“ یہاں کی دو ندیوں ”درونا“ اور ”اسی“ کے ناموں سے مل کر بنا ہے جو شہر کے شمالی اور جنوبی اطراف میں بہتی ہیں۔ لیکن مذہب سے منسلک اور متعلق ہونے کے سبب زمانہ قدیم سے ہی اس مقام کا نام ”کاشی“ رہا ہے۔ ”کاشی“ کے لغوی معنی ہیں ”روشنی کا شہر“۔ چھ سو سال قبل مسیح مہاتما بدھ یہاں آئے تھے۔ شاندار مندروں اور آٹھاون کلو میٹر کی لمبائی میں پھیلے ہوئے پر رونق مصروف گھاٹوں والا یہ شہر سنسکرت زبان کی تعلیم کا ایک اہم مرکز رہا ہے..... وقت کے ساتھ ساتھ کاشی میں بھی بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں۔ لیکن تاریخ کے سینے میں قلب کی مانند دھڑکتا ہوا کاشی کل بھی اہم تھا، آج بھی اہم ہے، کل بھی اہم رہے گا۔ تاریخ اس کی اہمیت کی ضامن و محافظ رہی ہے..... گزشتہ ڈیڑھ سو برسوں میں رونما ہونے والے واقعات، غلامی کے دور، جنگوں، جدوجہد، آزادی، ترقی، آبادی میں بے حساب اضافہ..... ہر چیز کے اثرات کاشی پر بھی پڑے ہیں اور کاشی میں بھی بہت سے تغیر رونما ہوئے ہیں۔ آج سے 165 برس قبل 1835ء میں بھی اس کے کنارے پر گنگا بہتی تھی، لیکن وہ شفاف، نقرے ہوئے نرم پانی کی مہریان گنگا تھی۔ اس وقت بھی کاشی کی صبح خوبصورت ہوتی تھی، لیکن آج کے کاشی کے صبح

عجیب تھے..... کشمی لڑتا..... جس میں وہ بکٹا تھی..... بندوق چلاتا..... جس میں وہ ماہر تھی..... ششیر زنی..... جس میں وہ طاق تھی..... گھوڑ سواری..... جو اُس کا کھیل تھا۔ وہ اپنی عمر کے لڑکوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ اور جلدی درخت پر چڑھ جاتی تھی..... اپنی عمر کے لڑکوں سے زیادہ لمبی چھلانگ لگاتی تھی..... ان سے زیادہ اونچائی سے کودتی تھی..... وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں کی ہی نہیں اپنے ہم عمر لڑکوں کی بھی ہیرو تھی۔ بڑی عجیب بات یہ تھی کہ اس تمام سہیلیاں اور تمام دوست اس پر رشک تو کرتے تھے، لیکن اس سے حسد کسی کو نہیں تھی۔

دلیری میں وہ بے مثل تھی۔

شجاعت کی وہ ایک مثال تھی۔

وہ نوانیت اور مردانگی کا حسین ترین احراز تھی۔

وہ ایک ندرت تھی..... جسے انسان بنا کر قدرت نے بندیل کھنڈ کے حوالے کر دیا تھا۔ کاشی سے اس کا رشتہ ختم ہو چکا تھا۔ اب وہ بندیل کھنڈ کی بیٹی تھی۔ بندیل کھنڈ کی دھرتی اس کی ماں تھی۔

بندیل کھنڈ کو اپنی بیٹی پر تاز تھا۔

منوبندیل کھنڈ سے دیوانہ وار محبت کرتی تھی۔

بندیل کھنڈ نو کی دل کی دھڑکن تھا۔

منوبندیل کھنڈ کی جان تھی۔

اور پھر..... ایک دن منو اور بندیل کھنڈ ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہو گئے۔ ایک رشتے کے استحکام نے دونوں کو ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم کر دیا.....

تیرہ برس کی عمر میں منو کا بیاہ جھانسی کے راجہ گنگا دھر راؤ سے ہو گیا۔

منو کشمی بائی بن گئی..... رانی کشمی بائی۔

سولہ برس کی عمر میں رانی کشمی بائی نے ایک بیٹے کو جنم دیا..... گنگا دھر راؤ

کے وارث کو..... جھانسی کے راجہ کمار اور ہونے والے راجہ کو۔ ساری جھانسی کو دلہن کی طرح سجایا گیا اور جشن منانے کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا..... ہندن وار باندھے گئے، منگل گیت گائے جانے لگے..... لیکن یہ منگل گیت ابھی پورے بھی نہ ہوئے کہ راجہ کمار کی زندگی کے دن پورے ہو گئے.....

تین مہینے کی عمر پوری کر کے راجہ کمار جاتا رہا۔

منگل گیت خاموش ہو گئے.....

خوشیاں مر جھا گئیں.....

ہندن وار مر جھا گئے.....

جھانسی مر جھا گئی.....

سب سے بڑی بات یہ کہ راجہ گنگا دھر راؤ مر جھا گئے۔ بیمار یوں نے انہیں جھکا تو پہلے ہی رکھا تھا، بیٹے کی موت سے ٹوٹ گئے۔ جو مرض اب تک اجاگر نہ ہوا تھا، اب پوری طرح سے خود کو عیاں کرنے لگا..... ہر کھانسی کے اختتام پر منہ سے خون آنے لگا۔ انھوں نے رانی سے صلاح کی اور دونوں نے اپنی ذات کے ایک بچے کو گود لے لیا جس کا نام آئندہ راؤ تھا۔ گود لینے کے بعد اس کا نام دامودر راؤ رکھا گیا۔

لیکن دامودر راؤ ابھی راجہ گنگا دھر راؤ کے دکھوں کو دور نہ کر سکا۔ وہ ایک صبح اٹھے تو طبیعت زیادہ خراب محسوس ہوئی..... کچھ دیر انتظار کیا، پھر گنگا جل مانگا۔ رانی کشمی بائی نے بایاں ہاتھ گردن میں ڈال کر سر کو دھیرے سے اٹھایا اور اپنے ہاتھ سے راجہ صاحب کو گنگا جل پلایا اور ان کا سر دھیرے سے نیچے پر رکھ دیا۔

راجہ صاحب کے منہ سے ”اوم ہری“ نکلا اور وہ زندگی کی قید سے آزاد ہو گئے۔ رانی کشمی بائی کی دنیا تاریک ہو گئی۔ اٹھارہ سال کی عمر بیوہ ہونے کی عمر تو نہیں ہوتی! کچھ دیر تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ یہ کیا ہو گیا تھا۔ زندگی نے کیا بے یاسک حریق کیا تھا اس کے ساتھ۔ اس نے ابھی دیکھا ہی کیا تھا؟..... اس نے خود کو تہائی کی آغوش میں ڈال دیا۔

لیکن وہ لکشی بائی تھی۔ تہائی اسے راس نہیں تھی۔ آجھی کیسے سکتی تھی؟ وہ صرف لکشی بائی ہی نہیں تھی..... جھانسی کی رانی بھی تھی۔ اس کی زندگی اس کی اپنی کب تھی! وہ تو جھانسی کی تھی..... جھانسی کے لئے تھی..... اور جھانسی سوگوار تھی۔

اس سوگوار جھانسی نے جلد ہی اُسے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

رانی لکشی بائی نے اپنے چاروں طرف بکھری ہوئی سوگوار، اداس، پریشان حال، خاموش جھانسی پر نظر ڈالی..... اور اپنے فولادی عزم کے طاقتور ہاتھوں سے اپنی بکھرتی ہوئی زندگی کو اس کے چٹائی مرکز پر سمیٹ لیا، قصد کے آنگن، میں، بچا کر لیا۔ جو آنسو بہہ رہے تھے انھیں اس نے حوصلہ مند انگلیوں سے پونچھ ڈالا..... جو آنسو بہنے کے لئے جنم لے رہے تھے انھیں اس نے جنم لینے سے پہلے ہی موت کی نیند سلا دیا.....

اس نے خود سے کہا..... ”من منو..... تو اب منو نہیں ہے..... تو اب چھیلی بھی نہیں ہے..... اب تو لکشی بائی ہے..... پر تو صرف لکشی بائی ہی نہیں ہے..... تو جھانسی کی رانی بھی ہے..... تیرا جیون تیرا اک ہے.....؟؟؟ وہ تو جھانسی کا ہے..... تجھے جندہ رہنا ہے تو جھانسی کے لئے مرنے ہے تو جھانسی کے لئے۔“

اور اپنے گرد پڑے ہوئے تہائی کے تمام پردے اُس نے پھاڑ ڈالے۔

اپنی رعایا کی اشک شونی کو اُس نے اپنی زندگی کا پلن بنالیا۔

رعایا کے غم کو اُس نے اپنا غم کر لیا۔

رعایا کی خوشی کو اس نے اپنی خوشی بنالیا۔

رعایا کے سکھ چین اس کی آرزو بن گئے۔

رعایا کی فلاح اُس کی ذمہ داری بن گئی۔

رعایا کی بہبود اس کا فرض۔

راجا جی کے انتقال کے بعد راجہ کی، پر جا کی مکمل ذمہ داری رانی کے ہاتھ

کا دھوڑ پر آپڑی تھی۔ رانی کے کندھے ہاتھوں پر تھے، لیکن بہت مضبوط تھے۔ اس نے ذمہ داریاں قبول کر لیں، ساری فکریں اپنے سر لے لیں..... خود کو مشکلوں کے حوالے کر دیا..... دشواریوں کے جڑے میں ڈال دیا۔ تاج اختیار کرنے والا سر بو جھل ہو ہی جاتا ہے..... لکشی بائی کے معصوم سر پہ جو..... تاج تھا وہ کچھ زیادہ ہی وزن تھا..... اُس کی تیز اور دور بین نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ منفی حالات ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اُس کی گرد حلقہ بنائے کھڑے ہیں۔ ان حالات کے چہرے پر بڑی بے دردی تھی..... بڑی بے رحمی تھی..... سنگ دلی حالات کے پیکر میں ڈھل گئی تھی..... اور ان حالات کے تیر بہت خراب تھے۔

اگر ہر طرف اپنے جبر پھیلاتے جا رہے تھے..... سارے ملک پر اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے ہر ہتھکنڈا اپنا رہے تھے۔ جھانسی پر ان کی نگاہیں بہت دن سے تھیں۔ انھیں اندازہ ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ جھانسی کے زوال کے بعد بخور، اُرنی، کالپی، مورینا، گوالیار، شیوپوری، جھنڈ، دتیا، بلب پور، گنا، فیکم گڑھ، چھتر پور..... سبھی ٹوٹ جائیں گے۔

حکومت کرنے اور دوسروں کو اپنا مطیع بنانے کی جہلت کا شکار انسان اپنے ارتقا کے آغاز سے ہی رہا ہے۔ ٹھنڈے ملکوں کے ٹھنڈے دماغ کے لوگ اس بدعت کا شکار ہونے میں ماہر رہے ہیں۔ حکومت کرنے کی خواہش کی پرورش کرنے اور اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہر ہتھکنڈا اپنانے میں ٹھنڈے دماغ کے سفید فاموں کو ملکہ حاصل رہا ہے۔ ٹھنڈا دماغ زیادہ بڑا منصوبہ بنا سکتا ہے، زیادہ کارگر منصوبہ بنا سکتا ہے..... زیادہ ٹھنڈی بے رحمی کا مظاہرہ کر سکتا ہے، زیادہ ٹھنڈا ظلم کر سکتا ہے۔

اگر یزیدوں نے یہی کیا۔

انھوں نے ہندوستانیوں کی ہر کمزوری کو بڑے ٹھنڈے منصوبہ بند طریقے سے اُبھارا، کہیں لالچ دیا، کہیں لڑایا، کہیں منافرت پھیلانی، نظریاتی تا اتفاقیوں کو



ہوادی..... ملک کو کمزور کیا..... آقا بن گئے.....

آقائی قانون سازی کی ترغیب دیتی ہے.....

آقا قانون بناتا ہے..... غلاموں کی فلاح کے لئے نہیں، اپنی بہبود کیلئے.....

۱۸۵۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے گوند لینے کا قانون بنادیا..... اور

اس طرح جھانسی پر اپنے حق و حکومت کا اعلان کر دیا۔

ایس، انگریز ریزیڈنٹ، گورنر جنرل کا یہ حکم لے کر قلعے میں پہنچا۔ رانی  
پردے کے پیچھے چلی گئی۔

ایس نے جب سے فرمان نکالا اور دھیرے دھیرے مگر بلند آواز میں گورنر  
جنرل کا فرمان پڑھ کر سنایا..... سارا دربار سناتے میں آگیا۔ رانی کے والد مور و پنت  
نے اپنا سر پڑھ لیا۔

رگھوناتھ سنگھ کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

بھادو بھنشی کے جڑے اتنی سختی سے پہنچ گئے کہ گالوں کے اوپر سے نظر آنے  
لگے۔

غلام غوث خاں کے جڑوں کی ہڈیاں گالوں کے اوپر سے نظر آنے  
لگیں۔ آنکھیں اس طرح سرخ ہو گئیں جیسے ابھی ہونچا دیں گی۔

جواہر سنگھ کا بدن کانپنے لگا۔

گل محمد کا ہاتھ اپنی تلوار لکھ دے پر چلا گیا۔ اُسے اگر اپنی ”مارانی ساب“ کا  
ادب ملحوظ نہ ہوتا تو اب تک وہ تلوار نکال چکا ہوتا اور اس کی تلوار ایس کے سینے کے  
پار ہو چکی ہوتی۔

دربار کا وہ سناتا ایس کو بہت ڈراتا لگا۔ رگھوناتھ سنگھ، بھادو بھنشی، غلام غوث  
خاں اور جواہر سنگھ کے چہرے اس کی نگاہوں کے سامنے تھے..... گل محمد کے تیور  
بھی اس کی نگاہوں کے سامنے تھے..... لیکن وہ سرد ملک کا باشندہ تھا، اعلا تعلیم حاصل  
کئے ہوئے تھا، نفسیات کا طالب علم رہ چکا تھا، چہروں کو پڑھنا تو اسے آتا ہی

تھا، اور اس کو پڑھنے میں بھی اسے کمال حاصل تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ الفاظ کی کاٹ  
کیسی ہوتی ہے، اور اسے یہ بھی علم تھا کہ الفاظ سے اپنا بھیاؤ کس طرح کیا جاتا ہے۔ وہ  
دیکھ رہا تھا کہ رانی کشمی بائی کے یہ درباری اچانک جوالا کھکی بن گئے ہیں اور کسی دم  
بھی لاوا اٹھنے والا ہے، اس لئے اس نے بڑی لا تعلقی کے ساتھ کہا..... ”میں ایک  
معمولی افسر ہوں۔ مسٹر مالک سے مجھے گورنر جنرل صاحب بھادو کا جو حکم (حکم) ملا  
تھا، میں نے سنا ڈیا۔ میرے بارے میں آپ سب جانتے ہیں..... میں ہمیشہ سے  
جانی (جھانسی) کا ڈوسٹ رہا ہوں..... پھر میں کیا کار سکتا ہوں؟ کانون کمپنی بنانا ہائے۔  
ہم سب کمپنی کا حکم سے بندھا ہائے۔ پھر بھی میں سے جو بن پر اکید۔ میں سفارش کیا  
اور میرا سفارش پر رانی صاحب کو پانچ ہزار روپیہ مہینہ کا پنشن منظور کار لیا گیا..... میں  
سمجھتا کہ رانی صاحب اور ان کا فیملی کا واسطے پانچ ہزار مہینہ کا پنشن کافی ہو گا۔“

”نہیں چاہئے مجھے پنشن“ پردے کے پیچھے سے رانی کی تیز نوکیلی آواز  
آئی۔ ”میں اپنی جھانسی نہیں دوں گی۔“

ایس نے ایک طویل سانس لی اور کھڑا ہو گیا۔

بڑے متاسفانہ انداز میں اس نے سر ہلایا اور سر جھکائے ہوئے چھوٹے  
چھوٹے قدموں سے دربار سے نکل گیا۔ قلعے سے باہر آنے تک اس نے اپنے چہرے  
اپنے انداز، اپنی حرکات اور اپنی چال سے یہ تاثر دیا کہ جو کچھ ہوا ہے اس پر اسے بے حد  
رجح ہے..... اور اسے ایک نہایت ناگوار فریضہ انجام دینا پڑا ہے۔ لیکن قلعے سے نکلنے  
ہی وہ تامل ہو گیا۔ اسے خوشی تھی کہ کوئی لاوا انہیں بلوا، کوئی طوفان نہیں اٹھا۔

ایک گھنٹے کے بعد دربار برخواست ہو گیا۔ رانی اپنے کمرے میں چلی گئی۔  
پندرہ منٹ بعد اس کی خادمہ سہیلی سندر بائی نے اطلاع دی کہ گل محمد ملنا  
چاہتا ہے۔

رانی نے گل محمد کو کمرے میں ہی بلوایا۔

گل محمد کمرے میں داخل ہوا اور نگاہیں جھکا کر اور ہاتھ باندھ کر رانی کے

سامنے کھڑا ہو گیا۔

”کیا بات ہے گل محمد کھان؟“ رانی نے اپنی نرم آواز میں پوچھا۔  
 ”رانی سب.....“ گل محمد کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ رانی پھر نرم آواز میں  
 بولی ”کہو کیا چاہتے ہو؟“  
 گل محمد نے کہا ”حکم“

”حکم؟“ رانی نے قدرے حیرت سے دوہرایا ”کس بات کا حکم؟“  
 گل محمد نے کہا ”اس سفید فام خنزیر ایس کا سر دھڑ سے الگ کرنے کا۔“

## تیسرا باب

رانی نے اپنے سامنے ہاتھ باندھے اور نظریں جھکائے کھڑے چہ ہاتھ لیے  
 اور چٹان جیسے سینے والے اپنے اس پٹھان سپاہی پر ترس میں ڈولی ایک نظر ڈالی۔ وہ  
 نگاہیں صرف ترس میں ہی ڈولی ہوئی نہیں تھی بلکہ اس میں ستائش بھی تھی، احترام  
 بھی تھا، پیار بھی تھا، مستابھی تھی۔ اپنے سے ڈیڑھ گنی عمر کے چوڑی پیشانی، اونچی  
 ناک، معمول سے بڑے کان، گھنٹی ابرو اور بڑی بڑی بھوری آنکھوں والے اس پٹھان  
 کو رانی اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے کسی بچے کو دیکھ رہی ہو۔ گل محمد کا چوڑا چہرہ یوں تو  
 ہمیشہ ہی بڑا سخت لگتا تھا، اس وقت تو پتھر لگ رہا تھا..... مہر اگلائی پتھر۔ آنکھیں ہی  
 نہیں کان بھی سرخ ہو گئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ خون چہرے کے ہر حصے سے پھٹک  
 پڑنے کو بے تاب ہو گیا ہو، اندر ہی اندر جھل رہا ہو۔

”گل محمد“ رانی بے حد نرم آواز میں بولی ”میں جانتی ہوں..... تمہارا دکھ میں  
 جانتی ہوں..... تمہارا درد سمجھتی ہوں..... تم سب کا..... دکھ ایک ہی..... ایک ہی درد  
 سے تم سب چھٹ پڑا رہے ہو۔ یہ دکھ ہی تمہیں یہاں میرے پاس لایا ہے اور تم ایس کا  
 سر اس کے دھڑ سے الگ کرنے کا حکم مانگ رہے ہو..... انوشی (اجازت) چاہ رہے  
 ہو..... پر ایک ایس کا سر اگر اس کے دھڑ سے الگ ہو بھی گیا تو کیا ہو گا؟ کیا  
 انگریز (انگریز) ہار مان لیں گے؟ ہمارا دیش چھوڑ کر چلے جائیں گے؟..... ایسا کچھ نہیں  
 ہو گا گل محمد..... ایک..... یادو..... یادو..... یا سو انگریزوں کے کتل سے بھی ہماری  
 مسیحا مل نہیں ہو گی..... کیونکہ ہماری مسیحا انگریز نہیں ہیں..... نہ ان کی تاک

(طاقت) ہماری سیاہے..... ہماری سیاہے ہماری اپنی کم جوری (کنزوری)..... ہماری اپنی آپس کی پھوٹ، ہمارا اپنا بھوک دلاس (میش پرستی)۔ یاد رکھو، ہماری کم جوری دوسروں کی تاکت بن جاتی ہے..... اس لئے ہمیں اپنی کم جوری سے لڑنا ہے..... پہلے اس کم جوری کو اس آپسی پھوٹ کو اس بھوک دلاس کو ختم کرنا ہے اور پھر انگریجوں سے ایک لمبی لڑائی کے لئے کھد کو تیار کرنا ہے..... پہلے منسلک روپ سے، پھر شاریرک روپ سے (پہلے ذہنی اعتبار سے، پھر جسمانی اعتبار سے)۔ انگریج آسانی سے نہیں جائے گا۔ جتنے سکھرش سے اس نے ہماری ایک ایک انچ زمین حاصل کی ہے اس سے زیادہ سکھرش کرے گا وہ اس زمین پر اپنا بجا (بقضہ) بنائے رکھنے کے لئے۔“

”مادانی ساب“ گل محمد نے ہونو نگہ نیچے لئے ہوئے اپنی پاٹ دار لیکن جلتی ہوئی سی آواز میں کہا ”ام یہ سب نہیں جانتا..... ام آپ کا خادم آئیے..... آپ کا سپائی (سپائی) آئیے۔ ام آپ سے حکم مانگتا..... ام مادانی ساب فرنگی بنا کار کو اپنا ملک سے نکالنے کا واسطے قسم کھایا اور آپ کا پرچم کے نیچے آیا اور آپ کا قیادت قبول کیا..... فرنگی کو جہنم پہنچانا ملدا متعدد حیات ایسے..... ام فرنگی سے اپنا ملک آزاد کرانے کا عزم یا پھر فرنگی سے جنگ کرتے کرتے شہید ہو جانے کا عزم لے کر آپ کا حضور آیا..... جب ام شہید اوجائے تو آپ مادانی ساب امداد تیر پر ایک مضعی مٹی ضرور ڈالے گا۔“

پتھر کا جگر رکھنے والی رانی لکشی بانی کی آنکھوں میں آنسو آگئے، اسے محسوس ہوا کہ اگر وہ کچھ دیر اور خاموش رہی تو اس کا کلبجہ بھٹ جائے گا۔ لفظوں کا ایک سمندر اس کے اندر اٹھل پھٹل پچائے ہوئے تھا۔ ہر لفظ باہر آنے کو بے چین تھا، الفاظ کو اپنے اندر مزید قید رکھنا اس کے لئے مشکل ہی نہیں بلکہ نامکن ہو گیا..... اس لئے حتی الامکان اپنی آواز پر قابو رکھتے ہوئے اس نے منہ کھولا اور پھر الفاظ غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے نکلنے چلے گئے۔ ”میرے سپائی..... میرے بچے..... مرنے کی بات مت کرو..... تم لوگ مر گئے تو تمھاری یہ ماں کس کے سہارے زندہ رہے گی..... مرنے کی بات کر کے اپنی ماں کے دکھے ہوئے دل کو اور نہ دکھاؤ..... میری

عمر بھی تمھیں لگ جائے..... تم لاکھوں سال.....“  
انیس سالہ رانی کا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی پتھر پھٹل گیا۔  
گل محمد نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپایا۔  
پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

وہ تیزی سے مڑا اور اسی طرح دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے ہوئے تقریباً دوڑتا ہوا رانی کے کمرے سے نکل گیا۔ رانی بہت دیر تک اس کھلے دروازے کو دیکھتی رہی، جس سے گزر کر گل محمد باہر گیا تھا۔

پھر آنکھیں بند کر کے دھیرے سے اس نے اپنا جملہ مکمل کر دیا ”تم لاکھوں سال سلامت رہو گل محمد..... میں نے تمھیں جنم نہیں دیا ہے، لیکن تم میرے بیٹے ہو..... میں اپنے کو اس سسے بڑا سو بھا گیا شالی (خوش قسمت) اور بڑا مہمان محسوس کر رہی ہوں..... وہاں کتنی سو بھا گیا شالی اور کتنی مہمان ہو گی جس نے تمھیں جنم دیا ہے گل..... میں نے اُسے، تمھیں جنم دینے والی ماں کو دیکھا تو نہیں..... پر میں اسے سلام کرتی ہوں۔ اس استری نے کتنے مہمان کاریہ کئے ہوں گے کہ بھگوان نے اسے گل محمد جیسا بنا دیا ہے!“

اسی وقت کمرے کے دروازے سے آواز آئی ”خادمہ حاضر ہو سکتی ہے،

مہارانی صاحبہ۔“

رانی نے آنکھیں کھولیں۔

دروازے پر موتی بانی کھڑی تھی۔

موتی بانی ایک ر قاصدہ تھی۔ راجہ گنگا دھر راؤ کی ٹانگ شالامی ٹانگوں میں اداکاری کرتی تھی، رانی کو میرا کے بھجن سنانی تھی، رانی کے جاں نثاروں میں سے تھی۔ رانی سمندر، مندر اور کاشی بانی کی طرح موتی بانی کو بھی اپنی سہیلی سمجھتی تھی اور اس سے بھی اور بانوجوی سے بھی سہیلوں کا سلسلوک کرتی تھی لیکن موتی بانی بھی سمندر، مندر، کاشی اور جوی کی مانند ہی خود کو رانی کی خادمہ مانتی تھی اور خادمہ کی طرح ہی پیش آتی تھی۔ جھیس ستائیس برس کی سنہری سی رنگت گول چہرے، بڑی بڑی چنچل سی آنکھوں اور چھوٹے

سے گلابی دہانے والی راقصہ بے حد جین تھی اور رانی اس حقیقت سے واقف تھی۔

”آجاموتی۔“ رانی نے ایک طویل سانس لے کر کہا ”اجازت مانگ کر مجھے شرمندہ نہ کرو۔۔۔ میں اب کہاں کی رانی ہوں۔ راج پاٹ سب چلا گیا۔“

”آپ ہمارے دلوں کی رانی ہیں۔۔۔ مہارانی صاحبہ، آپ کا راج ہمارے دلوں پر ہے، جہانسی کے بچے بچے کے دل پر آپ حکمران ہیں۔ اللہ قادر مطلق آپ کو سلامت رکھے تاکہ جہانسی یتیم نہ ہو۔۔۔ آپ زمین کے اس ککڑے پر حکمران ہوں یا نہ ہوں۔۔۔ لیکن اس ملک کی تاریخ میں آپ ہمیشہ مہارانی کلشی بانی کے نام سے ہی پکاری جائیں گی، جہانسی کی رانی کے لقب سے ہی یاد رکھی جائیں گی۔“ دُور جذبات سے مغلوب ہو کر رانی نے بڑھ کر موتی بانی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور انھیں کس کے اپنے داہنے عارض کے ساتھ سمجھ بیچ لیا۔

”کیسے اچھے اچھے لوگ بھگو گئے ہیں! رانی نے دل ہی دل میں کہا اور موتی بانی سے بولی ”تو واقعی موتی ہے، میرے جیون کا ایک چمکدار موتی۔۔۔ میری سیکلی۔۔۔ میری بہن۔۔۔“

”شکریہ۔۔۔ بہت شکریہ مہارانی صاحبہ،“ موتی بانی نے گردن خم کر کے بھی تشکر کا اظہار کیا۔۔۔ موتی بانی کو اپنے موتی بنادیا۔۔۔ ایک معمولی انسان کو اپنی سیکلی بنا لیا۔۔۔ ایک راقصہ کو اپنی بہن۔۔۔ کتنی عظیم ہیں آپ!۔۔۔ ذرے کو آپ نے آفتاب کر دیا ہے۔ تار میں نے آپ کا احسان چکا سکوں گی، نہ کبھی شکریہ ادا کر سکوں گی پوری طرح سے۔۔۔“

”اچھا بس۔۔۔ بہت ہو چکا“ رانی نے ہلکی سی ڈانٹ لگائی ”تم جانتی ہو مجھے اپنی تار پھ اچھی نہیں لگتی۔ آؤ بیٹھو۔“

رانی نے موتی بانی کو اپنے پاس بٹھالیا۔

”ایک بات پوچھوں مہارانی صاحبہ؟“ موتی بانی کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

”پوچھو۔“ رانی نے اجازت دے دی۔

”ابھی جب میں آ رہی تھی تو میں نے یہاں سے گل محمد خان کو چاتے دیکھا تھا۔“ موتی نے کہا۔

”ہوں۔۔۔۔۔“ رانی نے سر ہلادیا ”وہ میرے پاس سے ہی گیا تھا۔“

”وہ۔۔۔۔۔ رانی صاحبہ۔۔۔۔۔ رور ہے تھے“ موتی بانی نے جھٹکتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔“ رانی کا لہجہ اداس ہو گیا۔ ”دور دتے ہوئے ہی یہاں سے گیا ہے۔“

”اگر آپ اسے گستاخی تصور نہ کریں تو میں پوچھوں کہ۔۔۔ کیا ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔“ موتی نے اپنا جملہ مکمل چھوڑ دیا۔

”میں سمجھ رہی ہوں تمہارا کیا مطلب ہے موتی“ رانی نے کہا۔۔۔۔۔ ”مگر تم۔۔۔۔۔ میں نہیں۔۔۔۔۔ تم بتاؤ کہ کون سی بات اس پاشاں (پتھر کے ستون) کو رلا سکتی ہے۔؟“

کچھ سوچتے ہوئے موتی بانی نے کہا ”یا تو آپ کی سزا۔۔۔ یا آپ کی دعا۔۔۔۔۔ دو

یہی چیزیں اس پتھر کے ستون کو رلا سکتی ہیں۔“

”میری موتی! رانی نے موتی کو لپٹالیا۔ ”تو جی جی بڑی بدھی ماں ہے میں تجھ پر

بے جا گرد (ہاز) نہیں کرتی۔ تو دیکھا اس پوگیہ ہے کہ تجھے چاہا جائے، اپنایا جائے۔۔۔ واقعی

میری دعا ہی تھی جس نے سہن عشتی کے اُس پر بت (وقت برداشت کے اس پہلے) کو اس کی جڑ سے ہلادیا، اسے رلا دیا۔۔۔۔۔ موتی۔۔۔۔۔ تم لوگ تو پچھلے جنم یا گئے جنم میں شو اس نہیں

رکھتے، پر میں رکھتی ہوں۔۔۔۔۔ اور یہ میرا پکا شو اس ہے کہ پچھلے جنم میں، میں نے کچھ اچھے

کرم کئے ہوں گے تبھی اس جنم میں مجھے، گل محمد، گلام گوٹ کھان، جہاں کھان (زماں

خان) خدا بخش، کالے کھان، لالہ، بھاد، بخش، جواہر سنگھ، رگھو ناتھ، ہتھو بھنگر، موتی

بانی، بانو جوی، سندھ بانی، سندھ، کاشی بانی اور بخش جیسے ساتھی ملے ہیں۔۔۔۔۔ اور بھگو گوان

سے میری پرار تھا ہے کہ اگلے جنم میں بھی مجھے یہی سب ساتھی ملیں۔۔۔۔۔ جنم چاہے

جہاں ہو۔۔۔۔۔ چاہے جب ہو۔“ موتی بانی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

رانی نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے اور بولی ”آنسو کم جوری

در شاتے ہیں موتی..... کم جور بن کے کیسے کام چلے گا؟..... کامیاب ہوتا ہے، کچھ پانا ہے تو آنسوؤں کو پیچھے چھوڑنا پڑے گا۔“

”ٹھیک فرمائی ہیں مہارانی صاحبہ“ موتی کے لیے میں مضبوطی تھی ”آنسو نہ کسی مسئلے کا حل ہیں نہ کسی کامیابی کی ضمانت۔ اب آپ ان آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں دیکھیں گی۔“

”میں یہی چاہتی ہوں موتی کہ تیری آنکھ میں کبھی آنسو نہ آئیں۔ اپنے کسی ساتھی کی آنکھوں میں، جہانسی کے کسی نواسی کی آنکھوں میں، پورے بھارت کے کسی نواسی کی آنکھوں میں..... آنسو نہیں دیکھنا چاہتی۔ سارے آنسو مجھے مل جائیں۔ ساری مسکائیں دیش واسیوں کو۔“

بڑی مشکل سے موتی پائی نے اپنے آنسو روکے۔

دوسری صبح آٹھ بجے جب رانی شیو مندر سے پوجا کر کے واپس لوٹی تو ہلکی ہلکی بوند اباندی ہو رہی تھی۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ گہرے کالے بادل چھائے ہوئے تھے، اور کانی نیچے تھے۔ جس سے لگتا تھا کہ کبھی کسی وقت تیز بارش شروع ہو سکتی تھی۔ بوند اباندی تو ٹھیک تھی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا لیکن اگر تیز بارش ہونے لگتی تھی تو محل کے مشرقی وسیع و عریض آئین میں سناٹا بٹاتا تھا۔

راجہ گنگا دھر رائے کے انتقال کے بعد رانی نے دن کے مختلف اوقات کو مختلف کاموں کے لئے وقف کر دیا تھا اور اپنے اس پروگرام پر سختی سے کاربند رہتی تھی۔

اُس کا دن صبح چار بجے شروع ہوتا تھا۔ اٹھ کر غسل کرتی تھی، پھر شیو مندر جا کر آٹھ بجے تک پوجا کرتی تھی، سچن سنتی تھی، پھر مندر سے واپس آکر محل کے مشرقی آئین میں چلی جاتی تھی جہاں شہر کی عورتوں کو گھوڑ سواری، تیر اندازی، تلواری، بندوق چلانا اور کشتی لڑنا سکھائی تھی۔ ان کاموں میں اس کی سہیلیاں سندھ، مندر، کاشی پائی اور بخشن اس کی مدد کرتی تھیں۔ ان چاروں کو اُن تمام عسکری فنون کی تربیت خود رانی نے دی تھی اور ان چاروں نے بڑی چاشنی بڑی پابست اور بڑی

لگن سے اپنی رانی سے تربیت لے کر بڑی جلدی مہارت حاصل کر لی تھی۔

آئین میں شہر کی عورتوں کی تربیت کا سلسلہ گیارہ بجے تک چلتا تھا۔ گیارہ بجے رانی پھر غسل کرتی تھی بمبوں کو کھانا کھلاتی تھی، اور تب خود کھانا کھاتی تھی۔ پھر لوگوں سے ملتی تھی، ان کے مسائل سنتی تھی اور انھیں حل کرتی تھی۔ اس کے ساتھی کسی بھی وقت اس سے مل سکتے تھے۔ یوں بھی ہر شخص ہر وقت اپنا مسئلہ، اپنی تکلیف، اپنی پریشانی لے کر اس سے مل سکتا تھا۔ شیو مندر میں پوجا کے وقت کو چھوڑ کر اپنی زندگی کا ہر لمحہ اس نے جہانسی اور اہل جہانسی کے لئے وقف کر رکھا تھا۔

اس سر منشی صبح مندر سے واپس آکر وہ ابھی بادلوں سے گھرے آسمان کی طرف دیکھ ہی رہی تھی کہ ہلکی بوند اباندی تیز بارش میں تبدیل ہو گئی۔ تیز بارش کا مطلب تھا مشرقی آئین کے کسرت اور تربیت کا شام یا پھر اگلی صبح تک کے اگلے التوا۔

کچھ ہی دیر میں بارش اور تیز ہو گئی۔

رانی اپنے کمرے میں آ گئی۔

پوجا کی تھالی اس نے ایک اونچے موٹے سے پرکھ دی اور جا کر بائیں جانب کی کھڑکی میں کھڑی ہو گئی اور بارش کا نظارہ کرنے لگی۔ بارش اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ بارش میں بیگانہ سے بچنے سے ہی بہت پسند تھا۔ اب جب بھی بارش ہوتی تھی۔ تو اسے اپنے لڑکپن کے دن یاد آجاتے تھے جب وہ سالن میں باغوں میں جھولے ڈھولاتی تھی اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ ساری دو پہر جھولے جھولتی تھی اور سہیلیوں کے ساتھ مل کر سالن کے گیت گاتی تھی، اونچی اونچی چیخیں لیتی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ ہوا میں اتنی اونچائی تک پہنچ جاتی تھی کہ دیکھنے والوں کے دل دہل جاتے تھے۔ لیکن اس کے لئے ہمت اور شجاعت کا کوئی بھی فعل محض کھیل تھا۔ چیخیں لیتے لیتے ہمیشہ اس کا پیچھا کرتا تھا بڑھا کر آسمان کو چھو لے، اپنے ہاتھ کی جنٹل سے بادلوں کو بکھادے، تیز تر کر دے۔ کیسے حسین دن تھے! آج بھی بارش کا نظارہ کرتے کرتے وہ اپنے لڑکپن میں پہنچ گئی۔

تبھی غلام نے گل محمد کے آنے کی اطلاع دی۔

بھولے بسرے بھی یہ خیال نہیں آتا تھا کہ وہ ان کی ملکہ نہیں ہے، اس لئے اس کے تمام ساتھی اگر دن میں دس بار بھی اس کے سامنے آتے تھے تو اپنے اپنے انداز میں اسی طرح اسے سلام کرتے تھے جیسے ایک عکراں کو کیا جاتا ہے۔

”بیٹھو..... بیٹھو تم لوگ“ رانی نے سر کڈوں سے بہتے ہوئے بڑے بڑے آرام دہ موڈوں کی طرف اشارہ کیا اور خود اپنی بڑی، اونچی، مسند نما کرسی پر بیٹھ گئی جس پر ہارنگی رنگ کی نعل کی ایک شال پڑی تھی۔  
تینوں بیٹھ گئے۔

رانی سوچنے لگی کہ اسے صرف گل محمد کے آنے کی اطلاع ملی تھی، پھر یہ بھاء بخشی اور جواہر سنگھ کیوں؟..... یقیناً گل محمد کے آنے کے بعد وہ دونوں آئے ہوں گے۔ بہر حال ایک مسفّرانہ نگاہ اس نے ان تینوں پر ڈالی۔  
”مہارانی جی“ بھاء بخشی بڑی غمگین سی آواز میں بولا، ”ایس نے انگریزی بندوبست شروع کر دیا ہے۔“

”اگر نہ شروع کرتا تو مجھے تعجب ہوتا“ رانی نے کہا۔ اس کی آواز جذبات سے یکسر عاری تھی۔ ”ویسے کیا بندوبست شروع کیا ہے اس نے؟“  
”دیوان سے دفتروں کی چابیاں لے لی ہیں، تمام کاغذات نکلوا رہا ہے اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ تمام کاغذات کی جانچ پڑتال کر رہا ہے..... اس کے یہ سارے ماتحت انگریز ہیں جو درود فارسی جانتے ہیں“ جواہر سنگھ نے بتایا۔

”کھاگیاں میں اسے کیا ملے گا؟“ رانی جیسے خود سے سوال کیا۔

”ملے گا کچھ بھی نہیں..... وہ کاغذات کی جانچ اس لئے کر بھی نہیں رہا ہے کہ ان میں سے کچھ ملے گا۔“ بھاء بخشی نے کہا: ”وہ تو جھانسی والوں کو اور پورے بھارت کو یہ دکھانا چاہتا ہے کہ جھانسی پر اب مہارانی جی کا نہیں کہیں بہادر کاراج ہے۔“  
”ٹھیک کہتے ہو۔“ رانی ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ اس کے گورے گول چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں کرب لہرانے لگا۔

## چوتھا باب

رانی نے چونک کر ملازمہ کی طرف دیکھا اور بولی ”بھاء“ اور بیٹھک میں بٹھاؤ۔“

ملازمہ چلی گئی۔ رانی نے آکر اپنے پنگ سے شال اٹھا کر شانوں پر ڈالی اور کمرے سے باہر آکر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ یہاں وہ اپنے خاصہ ساتھیوں سے ملاقات کرتی تھی۔ اونچی چھت اور چھت سے لگے روشن دانوں والا خاص بڑا کمرہ تھا جس کا داخلی دروازہ ایک چوڑے سے دLAN میں کھلتا تھا، دوسرا دروازہ جو اہنی طرف تھا رانی کی رہائش گاہ کی طرف کھلتا تھا بائیں جانب والا دروازہ ایک بائیںچے میں کھلتا تھا جس میں فرصت کے اوقات رانی اپنی سہیلیوں کے ساتھ چہل قدمی کر لیتی تھی۔ اس بائیںچے میں ایک کافی کشادہ لان تھا جو ہمیشہ ہر اہر ہتا تھا اور پھولوں کی کیاریاں تھیں جن میں موسمی پھول ہمیشہ ہی کھلے رہتے تھے۔

بیٹھک میں گل محمد ایک طرف ادب سے کھڑا تھا، لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔ بھاء بخشی اور جواہر سنگھ بھی بیٹھک میں موجود تھے اور گل محمد کے ساتھ ہی کھڑے تھے۔

بھاء بخشی اور جواہر سنگھ نے ہاتھ جوڑ کر کمرے کے بل جھک کر رانی کو پرنام کیا۔ گل محمد نے اپنے طریقے سے اپنا دہنا باز دینچے سے اوپر تین بار لہرا کر سلام کیا۔ لکشی بائی حالانکہ صرف نام کی رانی تھی، نہ اس کے پاس طاقت تھی نہ کوئی اویکار لیکن اہل جھانسی کے لئے وہ جھانسی کی رانی تھی جھانسی کے جسم پر تو اسے کوئی اختیار حاصل نہیں تھا مگر جھانسی کے دل پر اسی کی حکومت تھی۔ اس کے ساتھیوں کو

”اس میں جھوٹ بھی کیا ہے؟ جھانسی پرواکھی کیمپنی کا ادھیکار ہے۔ کل کے سوداگر آج کے مالک ہو گئے۔ پردوشی ہم کھد ہیں۔۔۔۔۔ سارے لوگ۔۔۔۔۔ اگر ہم ہندوستانی آپس میں لڑتے جھگڑتے نہ رہتے، ہم میں ایک ہوتا اور ہم نے کبھ سے کام لیا ہوتا تو آج یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ لیکن ہم ہندوستانیوں کو راگ رنگ، بھوگ ولاس (میش و عشرت) اور آپس کی لڑائیں، آپس کی دشمنیوں سے ہی پھر صت (فرصت) نہیں تھی۔ اکبر مہمان دوار اکام کیا ہوا شیر سے کیا کماری تک کا اکھنڈ بھارت ایک دھارمک بادشاہ کی انوکھی سوچ اور انوکھی مٹیوں کے کارن کھڑے ہو گیا۔۔۔۔۔ ہر کھڑے کے مالک نے صرف اپنا بھلا سوچا، راگ رنگ اور بھوگ ولاس کا جیون اپنا لیا۔۔۔۔۔ نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔ ہم گلام ہو گئے۔ اور گلامی کی یہ اودھی بہت لمبی ہے۔۔۔۔۔ یہ میں بتائے دیتی ہوں، اس لئے کہ ہم میں نہ ایک ہے نہ ہمارے پاس نیز تو (قیادت)۔۔۔۔۔ کھیر (خیر) اور کیا کر رہا ہے ایس؟

”تھانے میں اپنے آدمی بٹھائے ہیں۔۔۔۔۔ سارے ہندوستانی سپاہی چھوٹے دروغہ بڑے دروغہ سب ایک انگریزی ایس پی کی ماتحتی میں ہیں۔ کوئی بھی فیصلہ انگریز ایس پی اور انگریزی ایس پی کرتے ہیں۔ دونوں دروغہ اور سارے سپاہی صرف، حکم بجالانے والے غلام بنائے گئے ہیں۔“ جواہر سنگھ نے بتایا۔

”اپنے دیس واسیوں کی اس دشا کو دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔“ رانی نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر بڑے دکھ کے ساتھ کہا ”ہم اپنی ہی دھرتی پر، اپنے ہی آکاش کے نیچے ودیشیوں کے گلام ہیں۔ پر۔۔۔۔۔ کسور (تصور) کسی دوسرے کا نہیں ہے۔۔۔۔۔ اپنے اپرا دھی ہم کھد ہیں۔“

”سارے شہر میں منادی کروادی گئی ہے۔ اور برابر کروائی جا رہی ہے کہ جھانسی انگریزی حکومت کا ایک حصہ ہے۔ اب یہاں صرف اور صرف کیمپنی بھادار کا حکم چلے گا، کیمپنی بھادار کے بتائے ہوئے قانون چلیں گے اور ان حکموں کو یا ان قانونوں کو نہ ماننے والے کو سخت سے سخت سزا دی جائے گی۔“ بھادو بخشی نے بتایا۔

”ہم کم جور ہیں بھادو“ رانی پھر بڑے دکھ کے ساتھ بولی۔ ”اور یہ کم جور ہی ہم نے کھد اپنے لئے اگائی ہے اور گلامی کو گھلے لگایا ہے۔ کم جور ویکتی ہارنے سے بچ نہیں سکتا۔ گلامی کم جور راشٹر کا کلدھ بن کے رہتی ہے، ہم بکھرے ہوئے ہیں۔ بکھراؤ کم جور کی کوئی جنم دیتا ہے، اور کمجوری گلامی کو۔“

”مارا کمجوری کو مکار فرنگی نے ہوا دیا، پھر اس کا فائدہ اٹھایا۔“ گل محمد پہلی بار بولا۔

”ٹھیک کہتے ہو گل محمد کھان“ رانی نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔ ”لیکن بنیادی چیچ (چیز) ہے کم جور، اور اپنی اس کم جوری کے دوشی ہم کھد ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا آج بھی ہم جاگے ہیں؟ کیا آج بھی ہمیں اس سچائی کا گیان ہے کہ ہم کم جور ہیں؟ اور اگر گیان ہے تو کیا ہم اس کم جوری کو دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ کم سے کم مجھے ایسی کوئی کوشش نظر نہیں آتی۔ کھنڈو ہوا بنارس، میرٹھ ہوا دلی، بخور ہوا کانپور، ارٹی ہوا کالپی، دتیا ہوا گوالیار، مورنا ہوا جمنڈ۔۔۔۔۔ سب بکھرے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ سب اپنے اپنے راگ رنگ میں مست ہیں۔ یہ بکھراؤ، یہ الگادھائی کی نشانیاں ہیں۔ تحصیلوں کا کیا حال ہے؟“

”کل ہی کل میں ساری تحصیلوں میں انگریز تحصیلدار بھیج دئے گئے ہیں۔ سنا ہے پٹواریوں اور قانون گو اور قرق امینوں کے لئے سخت احکامات بہت جلدی بھیج دئے جائیں گے۔ فی الحال اپنی تحصیل میں انگریز تحصیلدار کا حکم قانون ہے۔“ جواہر سنگھ نے بتایا۔

”رانی ساب۔۔۔۔۔ یہ خدام کچھ عرض کرتا چا تا اے“ گل محمد نے اپنی سنجیدہ آواز میں کہا۔

”کہو گل محمد۔۔۔۔۔ اور سنو۔۔۔۔۔ تم میرے کھادم نہیں ہو۔۔۔۔۔ میرے ساتھی ہو، جیسے یہ سب میرے ساتھی ہیں۔ کہو۔۔۔۔۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔“

رانی نے بڑی اپنائیت کے ساتھ بولی۔

کام بھی نہیں کرتا چاہئے جس سے وہ مصیبت میں پڑے ان حالات میں انگریز رحم نہیں کرے گا، بڑی بے دردی سے سزا دے گا۔ آج کانوں بھی اسی کا ہے طاقت (طاقت) بھی اسی کے پاس ہے۔“

”سوال یہ ہے مہارانی جی کہ ہم لوگ کیا کریں؟“ جواہر سنگھ نے پوچھا ”انگریزوں سے لہا لینے کی کھاموش تیاری اور سہی سہی کا انتظار“ رانی نے کہا ”اور اس کے لئے جلدوری ہے کہ جتنا کمونل اونچا رہے..... سنو، انگریز..... راجا کو کھتم کر سکتا ہے، جتنا کو نہیں۔ جتنا کو دبایا جاسکتا ہے، کچلا جاسکتا ہے، کھاموش کیا جاسکتا ہے..... پر صرف کچھ دیر کیلئے۔ ہمیشہ کیلئے نہیں..... اس لئے کہ جتنا امر ہے۔ جتنا کو کھتم نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے جتنا کمونل اونچا رہتا چاہئے..... اگر اس کا حوصلہ بلند ہے تو ایک دن جیت اس کی ہوگی۔“

”ہم لوگ دیکھیں گے مہارانی جی کہ جتنا کے حوصلہ بلند رہیں۔“ جواہر سنگھ نے کہا اور رانی کھڑی ہو گئی۔

وہ تینوں بھی کھڑے ہو گئے۔

بیٹھک ختم ہو گئی۔

وہ تینوں سر جھکا کر کچھ سوچتے ہوئے اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف چلے گئے۔

رانی اپنے کمرے میں آگئی۔

پلنگ پر لیٹ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور گل محمد کے بارے میں سوچنے لگی۔ ”وہ کیوں آیا تھا؟ اس کی کھاموشی کے پیچھے کیا تھا؟ کیا کہنے آیا تھا جو نہیں کہہ سکا؟ وہ پھاڑاری کی بات پر اس کا چہرہ اور پتھر یلا کیوں ہو گیا تھا؟“ آدھ گھنٹہ وہ یوں ہی لیٹی رہی اور ان سوالوں کے جواب تلاش کرتی رہی، پھر اس نے ملازمہ کو بلا کر کہا ”جا کر گل محمد کھان کو اس کی ہیرک سے بلا کر لاؤ۔“

ملازمہ چلی گئی۔

رانی نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ

”ملا خیال ایسے مارانی سب کہ آپ کو پانچ ہزار روپیہ پنشن قبول کر لینا چاہئے..... مصلحت یہی ایسے..... ام جانتا کہ یہ پنشن بھی فرنگی ملعون آپ کو بہت دن نہیں دے گا، لیکن ابھی آپ کا انکار کا جواز بنا کر وہ کچھ اور ظلم بھی کر سکتا.....“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو گل محمد۔“ رانی نے اس کی بات کی تائید کی۔ میں نے بھی اس بات کے بارے میں بہت سوچا ہے، اور میں بھی اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ میں نے جلد بازی سے کام لیا ہے۔ مجھے انکار نہیں کرنا چاہئے تھا۔ مگر آؤیش (ٹیش) میں آکر میں انکار کر رہی..... مجھ سے ایک گھنٹی (غلٹی) اور ہو گئی ہے۔ مجھے یہ بھی نہیں کہنا چاہئے تھا کہ میں اپنی جھانسی نہیں دوں گی۔ اب ایٹس اور جلدی اور تیزی کے ساتھ ہمیں کم جوہر کر دینے کے جن کرے گا..... اور پوری کو شش کرے گا کہ میں ایسا کچھ نہ کر سکوں جس سے مجھے شہتی پر اپت ہو سکے اور میں کبھی بھی..... انگریزوں کے مکابلے میں کھڑی ہو سکوں۔“

”یہ کوشش اس نے شروع ہی کر دیا ایسے مارانی سب“ گل محمد کی آواز بھینے ہوئے جڑوں کے درمیان سے نکلی۔

گل محمد کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ رانی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے کچھ کہنا، کچھ پوچھنا چاہا، لیکن پھر نہ جانے کیوں فوراً ہی اپنا راہ بدل دیا، اور بھاء بخشی سے بولی ”ہماری جتنا کمونل (ہمت اور حوصلہ)؟“

”عام طور سے بہت گر گیا ہے۔“ بھاء بخشی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”لیکن جتنا انگریز کی دشمن ہے..... وہ آج بھی آپ کی ہے..... وہ آج بھی بھوک پیاسی آپ کی ایک آواز پر گھروں سے نکل آئے گی۔ جھانسی کا بچہ بچہ آپ کا وفادار ہے، جان نثار ہے۔“

گل محمد کے جڑوں اور تختی سے بھینچ گئے۔

رانی نے ایک نظر گل محمد کے چہرے پر ڈال، پھر فوراً ہی جواہر سنگھ اور بھاء بخشی سے بولی ”جتنا کمونل مگر تا نہیں چاہئے..... لیکن ساتھ ساتھ انھیں کوئی ایسا



بہت زیادہ فکر مند تھی۔ وہ جانتی تھی کہ انگریز بہت ہی مکار قوم ہیں..... بلا کے ختمہ پرواز..... اور ہندوستانی بھولے ہیں۔ اسے فی الحال امید کی کوئی کرن نظر نہیں آرہی تھی۔ صرف جہانسی کا ہی نہیں پورے ہندوستان کا مستقبل اسے تاریک نظر آ رہا تھا۔ وہ جانتی کہ انگریزوں کو ملک سے نکالنا بکھرے ہوئے ہندوستانیوں کے لئے بہت مشکل ہو گا۔ قریب قریب ناممکن۔

پندرہ منٹ بعد ملازمہ نے گل محمد کے آنے کی اطلاع دی۔

رانی نے اٹھ کر شال شانوں پر ڈالی اور کمرے سے نکل کر بیٹھک میں آگئی۔ گل محمد ایک طرف ہاتھ باندھے اور نظریں نیچے کئے ہوئے کھڑا تھا۔ رانی کے بیٹھک میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنے مخصوص انداز میں رانی کو سلام کیا۔

”بیٹھ گل محمد۔“ کہہ کر رانی اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”بہت شکریہ مارانی سب“ گل محمد ایک موڑھے پر بیٹھ گیا اور بولا ”حکم؟“

”تم ابھی کچھ دیر پہلے میرے پاس آئے تھے“ رانی نے کہا۔

”جی مارانی سب“ گل محمد نے نگاہیں جھکائے ہوئے کہا۔ ”ادب سے کہا۔“

”اکیلے آئے تھے یا بھاء بخشی اور جوہر سنگھ کے ساتھ؟“ رانی نے پوچھا۔

”ام اکیلا آیا تا ملائی سب“ گل محمد نے بتایا ”بھاء سب اور بخشی سب بعد

میں آگیا تا..... بعد میں کیا وہ لی آ رہا تا۔ یہیں پر مل گیا تا۔“

”تم کسی ضروری کام سے آئے تھے؟“ رانی نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے

پوچھا۔

”جی مارانی سب۔“ گل محمد نے بدستور نگاہیں جھکائے ہوئے جواب دیا۔

”کیا ضروری کام تھا؟“ رانی نے دلچسپی کے ساتھ دریافت کیا۔

”مارانی سب کا سلامتی، جہانسی کا سلامتی، ہندوستان کا سلامتی سے زیادہ

ضروری کام کیا ہو سکتا۔؟“ جواب میں گل محمد نے ایک سوال جیسے خود سے کر ڈالا۔

”کھل کر کہو۔ گل محمد“ رانی نے بڑی نرم آواز میں کہا۔

”مارانی سب..... امارا خیال ایسے..... خدا کرے امارا خیال غلط او..... شیطان مردود کے کان بہرے..... پر مارا خیال ایسے کہ جہانسی میں سبھی آپ کا وفادار نہیں ایسے..... جہانسی کا بات جانے دیں..... خود قلعے میں سب آپ کا وفادار ایسے..... ام کو اس میں شک ایسے..... کچھ اور ہا ایسے..... قلعے میں کچھ اور ہا ایسے۔“ گل محمد کی نگاہیں اب بھی زمین پر تھیں۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ رانی کی دلچسپی میں اضافہ ہو گیا۔ ”مجھے..... یاد ہے کہ ابھی کچھ دیر پہلے جب بھاء بخشی نے کہا تھا کہ جہانسی کا بچہ میرا وپھادار اور جاں نثار ہے تو تمھارا چہرہ ایسا ہو گیا تھا جیسے تمھیں اس میں شک ہو..... آکھر کیا ہے تمھارے من میں؟ کیا محسوس کر رہے ہو تم؟“

”الہی ام بتائیں سکتا..... محسوس کرتا ہے..... کچھ اور ہا ایسے۔“

گل محمد کے لہجے میں تشویش تھی۔ ”ایک گزارش لے کر آیا ہے۔“

”بولو.....“ رانی اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔

”دل کا بات، ارادے کا بات، منصوبے کا بات آپ اپنا بہت خاص الحاح

لوگوں کا سات کریں مارانی سب..... نہ وقت سازگار ایسے، نہ حالات۔“

تقریباً دو منٹ تک ان دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔ اس سارے وقت

گل محمد کی نگاہیں زمین پر رہیں اور رانی کی نگاہیں گل محمد پر۔

بالآخر رانی نے کہا ”تمھیں کس پے شک ہے؟“

جواب میں کچھ کہنے کے بجائے گل محمد کھڑا ہو گیا، ہونٹوں پر انگلی رکھ کر رانی

کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا، بغیر آواز کے چلا آواز دوازے تک گیا اور پھر جھپٹ کر

دروازے سے باہر نکل گیا۔

دوسرے ہی لمحے رانی نے ایک نسوانی چیخ سنی۔ چونک کر وہ اپنی کرسی سے

کھڑی ہو گئی۔

اسی وقت گل محمد اسی خامدہ کو اس کے بالوں سے پکڑ کر کھینچا ہوا اندر لے آیا

جو اسے بلانے مئی تھی۔ درد اور خوف سے ملازمہ کے منہ سے بڑی بے ربط اور بے  
ہنجم چیخیں نکل رہی تھیں۔

رانی حیرت سے کبھی ملازمہ کو دیکھ رہی تھی کبھی گل محمد کو۔

گل محمد نے ملازمہ کے بال پکڑے پکڑے اسے ایک تیز جھٹکا دیا اور ملازمہ پٹ سے رانی کے قدموں میں مگری۔

”اس سے دریافت کیا جائے ماری سب کہ یہ دروازے کے باہر دیوار سے کان لگائے امار اور آپ کا بات سننے کا کوشش کیوں کر کرتی تھی۔؟ اس سے اس کا مقصد کیا تھا؟ کس کا اشارہ پر یہ آپ کا جاسوسی کر کرتی تھی؟“ گل محمد رانی کے قدموں میں پڑی ملازمہ کو خونخوار نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

”کھڑی ہو جا دلاری۔“ رانی نے ملازمہ کو حکم دیا۔

”ماچھ کر دیجے مہارانی جی.....“ ملازمہ گڑغڑائی اور اس نے ہاتھ بڑھا کر رانی کے پیر پکڑ لئے۔

”میرے بڑا اپنے گندے ہاتھوں سے چھوڑ بیچ پاپن، رانی نے غصے سے کہا ”یہ  
- بڑا مندر میں جاتے ہیں تو نے انھیں اپنے گندے ہاتھوں سے چھو کر اپو تر کر دیا ہے۔  
کھڑی ہو جا۔“

ملازمہ نے پیر تو نہیں چھوڑے، اپنی پیشانی رانی کے حیدروں پر رگڑنے لگی۔ اس کے منہ سے غیر واضح، مبہم اور ناقابل فہم الفاظ نکل رہے تھے۔ رانی نے اپنے پیر چھڑانے کی کوشش کی مگر ملازمہ جو کم کی طرح اس کے حیدروں سے چٹلی رہی۔

مجبور ہو کر رانی نے گل محمد سے کہا ”گل محمد اسے کھڑا کر دو۔“

گل محمد نے آگے بڑھ کر پھر ملازمہ کے بال منھ میں جلاڑے..... اور پھر ملازمہ ایک طویل، اذیت میں ڈوبی بیچ کے ساتھ کھڑی ہوتی چل گئی۔ اس کا چہرہ سفید ہو گیا تھا اور سارا بدن تھر تھرتھار رہا تھا۔

گل محمد نے اس کا چہرہ اپنی طرف کر کے اس کی آنکھوں میں اپنی خون جیسی سرخ بڑی بڑی آنکھیں ڈال کر خوشخوار لہجے میں کہہ ”اب یہ تانک بند کر بد ذات زن..... اور مارانی سب جو کچھ دیانت کرتی بتا، ورنہ ام ترے جسم کا ریشہ ریشہ اپنے پشیمان ناخن سے اوھیر ڈالے گا۔ امارا نام گل محمد خان ولد جابر خان کو ہی۔ ام رحم سے واقف نہیں او تاغداروں کا معاملہ میں..... زبان کھول ملعونہ۔“

ایسا لگا کہ ملازمہ کے رہے سہے حواس بھی جاتے رہے۔ اس کی پتیلیاں چڑھنے لگیں۔

لیکن وہ بے ہوش ہو کر نہیں مری۔

مر کے گری۔

روشن دان سے چلنے والی بندوق کی گولی اس کے سینے پر ٹھیک دل کے مقام پر لگی تھی۔

چہروں پر تشویش تھی، تھک تھا، طیش تھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ دھارانی کی آواز بیٹھک میں گونجی۔ ”آج میرا مجرم نوٹ مہیا۔ میں سمجھتی تھی کہ جھانسی کا کوئی ویکٹی گدار (خدار) نہیں ہو سکتا۔ لیکن جو کچھ ہوا ہے وہ آپ سب کے سامنے ہے۔ اگر گل محمد کو شک نہ ہو جاتا اور وہ اپنا شک منانے دے پاؤں بیٹھک سے باہر نہ گئے ہوتے تو آج بھی پتہ نہ چلتا کہ میرے خلاف جاسوسی ہو رہی ہے۔ نہ جانے کتنی باتیں، کتنے راج (راز) گل کے باہر پہنچ چکے ہوں گے۔ اکھر دلاری بانی کس کیلئے جاسوسی کر رہی تھی؟ اور وہ کون تھا جس نے اسے گولی کا نشانہ بنادیا؟ یہ تو ایسا لگتا ہے کہ پورا ایک چال بچھا ہے گل میں۔ کنور جواہر سنگھ۔ مجھے اپراوھی چاہئے۔ ہر حالت میں مجھے اپراوھی چاہئے۔“

”میں بہت جلد اپراوھی کو آپ کے سامنے پیش کر دوں گا، مہارانی جی“ جواہر سنگھ نے کہا۔ ”لیکن اس معاملے میں میری ایک صلاح ہے۔“

”کہو۔“ رانی نے کہا۔

”گل کی اور آپ کی حفاظت کی ذمہ داری گل محمد خان کو سونپ دی جائے۔ ان کی نظر بھی بہت تیز ہے یہ چوکنے بھی بہت رہتے ہیں۔“

”میں کنور جواہر سنگھ کی رائے سے سمبت (مشتق) ہوں مہارانی جی۔“ رگھوناتھ سنگھ نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ رانی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ”گل کی چھابٹ (حفاظت) آج سے بلکہ ابھی سے گل محمد کی جے واری ہے۔ یہ جس طرح سے چاہیں گل کی سرکشا (حفاظت) کا پر بندھ کریں۔ پراس ویکٹی کا یا ان لوگوں کا پتہ لگنا آپ سب کی جے واری ہے جو جاسوسی کر رہے ہیں۔ آپ سب لوگ جاسکتے ہیں۔ آپ یہاں ٹھہریں۔“ کنور گل محمد۔ ہاں ہم نے آج سے آپ کو بھی کنور کی لمباوھی (لقب) دی۔ آج سے گل محمد کو ”کنور گل محمد“ کہہ کر پکارا جائے۔“

سب لوگوں نے اپنے اپنے طریقے سے رانی کو سلام کیا اور رخصت ہو گئے۔

## پانچواں باب

اور اس طرح یہ راز راز ہی رہ گیا کہ ملازمہ دلاری کس کے لئے کام کر رہی تھی کس کے کہنے پر جاسوسی کر رہی تھی، کس لالچ میں کر رہی تھی۔

”مارانی سب“ گل محمد چلایا تھا ”دیوار سے لگ کر کھڑا دوا جائے۔“ اس نے اس دیوار کی طرف اشارہ کیا جس کے اوپر کے روشن دان سے کسی نے گولی چلائی تھی اور ملازمہ کو منہ کھولنے سے قبل ہلاک کر دیا تھا۔

رانی پلک جھپکنے اس دیوار کے ساتھ سٹ کر کھڑی ہو گئی اور گردن موڑ کر اوپر روشن دان کی طرف دیکھنے لگی۔

گل محمد جیتے کی سی تیزی سے جھپٹ کر کمرے سے نکل چکا تھا۔ قلعے کا چپہ چپہ اس کا دیکھا ہوا تھا۔ جتنی تیزی سے ممکن ہو سکا وہ اوپر پہنچ گیا۔ پوری جیت خالی پڑی تھی۔

بہت دیر تک وہ کوشش کرتا رہا کہ اوپر کہیں کوئی سراغ مل جائے۔ لیکن کچھ بھی ہاتھ نہ لگا وہ نیچے آ گیا۔

پھر تلاش شروع ہوئی کسی ایسے شخص کی جسے کسی نے ہندو ق لئے اوپر جاتے دیکھا ہو۔

کچھ بھی پتہ نہیں چلا۔ بارش ہو رہی تھی اور کوئی بھی باہر نہیں تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد جواہر سنگھ، رگھوناتھ سنگھ، دو لمبا جو، پیر علی، غلام غوث خان، زمان خان، خدا بخش، مندر، مندر، کاشی بانی اور گل محمد رانی کی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے۔

## چھٹا باب

کپہنی نے کپہنیں گارڈن کو جھانسی کا ڈپٹی کمشنر بنایا جو ایک سخت گیر افسر تھا۔ ”نہیں“ سنا تو اسے آتا ہی نہیں تھا۔ جو چاہتا تھا کر گزرتا تھا اس لئے کہ کہیں کوئی سنوائی تو تھی ہی نہیں۔ کوئی ہندوستانی کسی زیادتی کی شکایت کرتا بھی تو کس سے کرتا؟“ اوپر سے لے کر نیچے تک سارے اہم عہدوں پر انگریز افسر ہی فائز تھے اور گارڈن کو تو کمشنرا کی کمزوری اور غیر مشروط تائید اور سرپرستی حاصل تھی۔ اس نے سب سے پہلے تو جاگیریں ختم کیں اور زمین داریاں قائم کیں۔ ایک ایک جاگیر کو اس نے کئی کئی زمینداروں میں بانٹ دیا۔ اس طرح طاقت کو توڑ کر گارڈن نے ٹکھڑا دیا۔ جو زمیندار اس نے بنائے وہ سب اس کے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے وفادار تھے۔ یہ وفاداری ان کی مجبوری تھی۔ ان کی بقا اور وجود کیلئے ضروری تھی۔ لالچ اور وقتی بہود حب الوطنی پر غلب آگئے تھے۔

مندروں کے ساتھ جو جاگیریں لگی ہوئی تھیں وہ بھی گارڈن نے ضبط کر لیں۔ پجاریوں کو، مہنتوں کو یہ بہت اکھڑا، لیکن احتجاج کس سے کرتے، فریاد لے کر کس کے پاس جاتے؟ جب بھی موقع ملتا۔ اپنا دکھ لے کر رانی کے پاس جاتے، مگر رانی خود مجبور تھی، بے بس تھی۔ اس کا وقت پوچھا پٹھ اور محل کے اس صحن میں گزرتا تھا جس میں وہ اور اس کی سہیلیاں سندر، مندر اور کاشی بانکی جھانسی کی عورتوں کو کسرت کراتی تھیں، تیر اندازی، توار زنی اور گھوڑ سواری کی تربیت دیتی تھی۔

ایک دن رانی نے گل محمد سے کہا ”جتنا کچھ میں اور میری سہیلیاں جانتی ہیں وہ

گل محمد ہیں ٹکھڑا گیا۔

سب کے جانے کے بعد اس نے کھڑے ہو کر ہاتھ باندھ کر اور حسب عادت نظریں جھکا کر کہا ”ام سپاس گزار ہے ماریں سب۔ آپ بہت مہربان ایسے۔ عظیم ایسے۔ اللہ آپ کو قیامت سلامت رکھے۔“

”دھنیہ واد کنور گل محمد۔“ رانی نے اپنے اس وفادار کو شفیق نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جیجھو۔“

”بہت شکریہ ماریں سب“ گل محمد بیٹھ گیا۔

”تم کچھ کہہ رہے تھے کنور گل محمد..... کچھ ہو رہا ہے..... تم کچھ محسوس کر رہے ہو۔“ رانی نے اسے یاد دلایا۔

”جی ماریں سب“ گل محمد بولا۔ ”جو کچھ ہو رہا ہے، جو کچھ ام محسوس کر رہا ہے وہ سامنے آگیا۔ جاسوسی..... غدار..... ام یہی محسوس کیا۔“

”کھل کر کہو۔“ رانی دھیرے سے بولی۔

”اما پاس ابلی کسی کا غدار کی کا کوئی ثبوت نہیں ایسے..... اور ممکن ایسے ماریں سب اما ادرا خیال غلط او۔ لیکن کم از کم دو لوگ ایسے جو مارا کو اچا نہیں لگتا۔ آخر یہ لوگ زیادہ تر قلعے کا باہر کیوں رہتا؟ کہاں جاتا، کیا کرتا، کس سے ملتا، کیوں ملتا؟“۔ اب ام اپنا ٹنگ دور کرنے کا واسطہ پتہ لگائے گا۔ ضرور پتہ لگائے گا۔“

”کون ہیں یہ دونوں؟“ رانی کے منہ سے پچھسہاٹ نکلی۔

گل محمد نے بھی اسی طرح پچھسہاٹ میں ہی جواب دیا۔ ”دیوان دولہا جو اور..... پاتا شاہ۔“

رانی سکتے میں آگئی۔

کافی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ ”تم اپنے طور سے پتہ ضرور لگاؤ۔ لیکن میں یقین نہیں کر سکتی۔ دونوں ہی سوگ واپس راجہ صاحب کے خوش اس پار تھے۔“

سب تو ہم سکھا چکیں۔ پر مجھے لگتا ہے کہ ابھی اور بہت کچھ کرنے کی جرورت ہے۔ کوئی ایسا کوئی مل سکے..... جو اس سے آگے بھی سکھا سکے۔ ہے کوئی، یکتی تمہاری خبر میں؟“

”اے ماری سب۔“ گل محمد نے جواب دیا۔ ”امارا ایک ساتی (ساتھی) آئیے۔“

امیر خان۔ او بھی راحت گڑھ کا باشندہ آئیے۔ ابلی فرنگی کا دشمن آئیے۔“

”اگر وہ یہاں آتا چاہے تو لے آؤں میں کوئی تنکھا (تنخواہ) نہیں دے سکوں گی۔ بس کھانا کھلا سکوں گی۔“ رانی نے بڑی افسردگی کے ساتھ کہا۔

”او تنخواہ لے گا لی نہیں۔ امارا کوئی ساتی (ساتھی) تنخواہ نہیں لے گا ماری سب۔“ بولا (جھوکا) کہ رانی آپ کا خدمت کرے گا۔“ گل محمد نے ہمیشہ کی طرح اپنی غیر جذباتی آواز میں کہا۔

رانی نے ہونٹ بھیج کر اپنی آنکھیں کس کے پیچ لیں۔

گل محمد خود نہیں گیا۔ اس نے اپنے ایک ساتھی سے راحت گڑھ امیر خاں کے پاس سندیرہ بھجوادیا۔

گل محمد اب جو پیش گھنے رانی کے ارد گرد رہتا تھا۔ اس کی موجودگی رانی کے لئے باعث طمانیت تھی۔ وہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ محل کے غداروں کا پتہ لگا سکے..... معلوم کر سکے کہ ملازمہ دلاری کس کے لئے رانی کی جاسوسی کر رہی تھی اور کس نے اسے گولی ماری..... لیکن کچھ بھی پتہ نہ چل سکا جو اہر سنگھ، رگھوناتھ سنگھ اور بھاؤ بھنشی بھی ناکام رہے۔ مجرم بہت چالاک تھے۔

دیوان دولہا جو اور پانا شاہ کے خلاف بھی گل محمد کو کوئی ثبوت نہ مل سکا۔ رانی نے بڑی خاموشی سے جوبی اور موتی کو دولہا جو اور پانا شاہ کی حرکات و سکنات پر نگاہ رکھنے کی تاکید کر دی تھی۔ مگر کئی اہم گزرتے جانے کے بعد بھی دولہا جو پانا شاہ کے بارے میں کوئی مفید خبر نہ مل سکی۔

بہر حال اگلے ماہ امیر خان آگیا اور رانی نے اسے صحن میں تربیت دینے کے

کام پر مامور کر دیا۔

امیر خان رانی کی توقعات سے کہیں زیادہ ہنرمند نکلا۔ رانی نے گل محمد کا شکریہ ادا کیا۔ یہ پٹھان اس کے لئے روز بہ روز زیادہ سے زیادہ ضروری ہو جا رہا تھا۔ اس کے لب بند رہتے تھے۔ آنکھیں گویا چوبیسوں گھنٹے کھلی رہتی تھیں۔ وہ تبھی بولتا تھا جب رانی اس سے کچھ دریافت کرتی تھی یا اسے کوئی اجازت لینے ہوتی تھی۔ رانی چاہتی تھی کہ کچھ شروع کیا جائے لیکن وہ جانتی تھی کہ کبھی تیاری سے حاصل کچھ بھی نہیں ہوگا، تاہم سب کچھ ہو جائے گا۔

رانی کی جاسوس جوبی اور موتی اسے محل کے باہر کی خبریں، جھانسی کی خبریں اور یہاں تک کہ کبھی کبھی انگریز افروں کے بنگلوں تک کی خبریں پہنچاتی رہتی تھی۔ رانی کے لئے جہاں یہ خبریں باعث تشویش تھیں کہ انگریزوں کی طاقت میں

دن بہ دن اضافہ ہو جا رہا تھا وہاں اس کے لئے یہ خبریں باعث اطمینان تھیں کہ جھانسی کے عوام انگریزوں سے نفرت کرتے ہیں اور دل سے رانی کے وفادار ہیں۔

رانی کو میرٹھ، دلی، لکھنؤ، ستارا، بھور، گوالیار، کالپی، اور دیتا کی خبریں بھی ملتی رہتی تھیں جو قطعی حوصلہ افزا نہیں تھیں۔ سب سے زیادہ حوصلہ شکن خبر یہ تھی کہ ہر طرف انتشار تھا، بکھرا ہوا تھا، کوئی کسی کی قیادت قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ مغل

بادشاہ بہادر شاہ ظفر ضعیف ہو چکے تھے۔ ان کی حکومت دلی کے لال قلعے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ خود قلعہ سازشوں کا مرکز بننا ہوا تھا۔

عوام البتہ ہر جگہ کچھ کر گزرنے کو تیار تھے۔ کچھ غداروں کو چھوڑ کر ہر جگہ

عوام انگریزوں اور انگریزی حکومت کے خلاف تھے۔

انگریز ہر جگہ غداروں کو ہوا دے رہے تھے۔

ایک رات ایک سپاہی بہرام الدین خاں نے گل محمد سے کہا۔ ”کنور سب ام کل رات ڈپٹی کمشنر گارڈن کے خانساں کو دیوان دولہا جو کے سات دیکھا۔ دونوں

کچھ دیر جنوبی دروازہ کے قریب دیوار سے لگا کڑا باتیں کیا، پھر خانساں چلا گیا، دیوان سب اندر آ گیا۔“

گل محمد نے یہ اطلاع رانی کو پہنچائی۔

”بلاؤ بہرام الدین کھان کو“ رانی نے حکم دیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد گل محمد نے بہرام الدین کو رانی کے سامنے پیش کر دیا۔

”تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ یکتی ڈپٹی کمشنر گارڈن کارسویا تھا؟“ رانی نے پوچھا۔

”ام اس کو بے چارنا، مارانی ساب، بہرام الدین نے بڑے ادب سے جواب دیا۔

”یہی تو میں جانتا تھا جی ہوں کہ تم اسے کیسے پہچانتے ہو“ رانی نے پوچھا۔

”ام اس کو ایک بار گوشت کا دکان پر دیکھا تھا (دیکھا تھا) او بولا۔ ام کو اچا گوشت

دو، نئی تو ام تمارا دکان بند کروادے گا۔ اور تم کو جیل میں بند کروادے گا۔ تم ام کو جانتا

نئی؟ ام ڈپٹی کمشنر ساب بھادر کا خاندان ایسے..... دکاندار اس کو سب سے اچا گوشت

دیا۔ او خدا کی خوار دکاندار کو پیسہ بی بی دیا۔“

”ہوں.....“ رانی کچھ سوچتی ہوئی بولی۔ ”تحصیل یقین ہے کہ وہ ڈپٹی کمشنر کا

ر سونیا ہی تھا؟“

”بالکل یقین ایسے مارانی ساب“ بہرام الدین خاں نے کہا ”ام جوٹ

(جھوٹ) کیوں بولے گا؟“

”نہیں نہیں..... میرا یہ مطلب نہیں تھا“ رانی نے جلدی سے کہا۔ پھر اس

نے گل محمد سے کہا ”ٹھیک ہے..... میں دیکھتی ہوں۔“

گل محمد نے بہرام الدین کو اشارہ کیا۔ بہرام الدین نے جھک کر رانی کو سلام

کیا اور چلا گیا۔

رانی کسی گہری سوچ میں دوپ گئی تھی۔

گل محمد نے کچھ دیر انتظار کیا، پھر وہ بھی سلام کر کے بیٹھک سے چلا گیا۔ لیکن

وہ آدھے گھنٹے کے بعد پھر رانی کے سامنے کھڑا تھا۔

”کہو کنور گل محمد“ رانی نے کہا۔

”مارانی ساب..... ساگر سنگھ گرفتار ہو گیا۔“

## ساتواں باب

ساگر سنگھ ساڑھے چھ فٹ لمبا چٹان سا آدمی تھا۔ بڑی بڑی سرخ آنکھیں کشادہ  
پیشانی، بڑے بڑے تے ترتیب ٹھنکھڑالے بال گھنے گل مجھے، گندی رنگت، پات دار  
آواز۔ جھانسی اور اطراف میں ڈاکے ڈالتا تھا۔ بہت دن سے انگریز اس کی تاک میں  
تھے، مگر جھانسی کے مضافات پہاڑیاں اور جنگل اس کی پناہ گاہ تھے۔ بہر حال مقامی  
لوگوں میں سے کچھ کو لالچ دے کر ڈپٹی کمشنر گارڈن نے ساگر سنگھ کے غور ٹھکانے کا  
پتہ لگا ہی لیا اور ایک دن صبح تین بجے ایک گاؤں کے ایک گھر میں پولس نے اسے  
دھر دوڑا۔ پولس نے دہش انگریز ڈی ایس پی کی قیادت میں ماری تھی۔ تیسرے دن  
کمشنر اسکین نے ڈپٹی کمشنر گارڈن کے ساتھ خود ساگر سنگھ سے جیل میں ملنے کا پروگرام  
بنایا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ ڈاکو بے کیا چیز جسے عوام کی اتنی حمایت حاصل ہے۔

مگر صبح ہی اسکین کو اطلاع ملی کہ گزشتہ رات ساگر سنگھ جیل سے فرار ہو گیا۔

اسکین آگ بگولہ ہو گیا۔

اب تو جیل جانا اور ضروری ہو گیا تھا۔

گارڈن کو لے کر وہ جیل پہنچا

خشیش علی جیلر تھے۔

اسکین نے جاتے ہی خشیش علی کے تمام ماتحتوں کے سامنے ہی اسے

ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ گارڈن نے بھی اپنے افسر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے

خشیش علی پر ٹھوکریں برسانی شروع کر دیں۔

خشیش علی چپ چاپ بے عزتی برداشت کرتا رہا۔

## آٹھواں باب

لیکن بد قسمتی سے وقت سے پہلے ہی بغاوت پھوٹ پڑی۔ منگل پانڈے نام کے ایک سپاہی نے ۲۹ مارچ کو بارک پور چھاؤنی (بنگلہ) میں ایک انگریز افسر کو گولی

ادھر بخشیش علی کے گھر میں اس کی بیوی کا روتے روتے برا حال تھا۔ بخشیش علی نے بڑھ کر اس کی آنسو پونچھے اور بولا۔ ”فکر نہ کرو۔ میں ..... اس ہنس کو مارتے دم تک بھول نہیں پاؤں گا۔“

مار کر زخمی کر دیا۔ بناوٹ کا آغاز ہو گیا۔

دہلی کھنڈ، کان پور، مردہ بیل کھنڈ (حس میں شاہجہاں پور، بریلی، مراد آباد اور میرٹھ کا علاقہ آتا تھا) اور بندیل کھنڈ (جس میں بنجور، رانی، کاپنی، جھانسی، دوتیا، گوالیار اور وسطی ہندوستان کے جھانسی اور گوالیار سے لگے ہوئے دوسرے علاقے آتے تھے) کرائی کاروں کے اہم مرکز تھے۔

ان پانچوں مرکزوں پر سپاہی اور عوام دونوں ہی کرائی کے لئے بے چین ہو رہے تھے۔ ایک ایک دن ان کے لئے کاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ سبھی لوگ کچھ کرنے کے لئے جباب تھے۔ آخر میرٹھ میں ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ اسرار مئی تک انتظار نہ کر سکے اور دس مئی کو ہی سپاہیوں نے بناوٹ کر دی اور دہلی سے لے کر واہہ ہو گئے۔ بارک پور کی بناوٹ کا کوئی بڑا منفی اثر انگریزی حکومت پر نہیں ہوا تھا، حالانکہ کرائی کاروں کو ہر جگہ اس بناوٹ نے تقویت پہنچائی تھی۔ لیکن میرٹھ کے سپاہیوں کی بناوٹ فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ اسرار مئی کو میرٹھ کے یہ باغی سپاہی گھنا مسجد کے پاس سے دہلی میں داخل ہوئے اور دہلی کی فوج کے ساتھ مل کر انھوں نے شہر پر قبضہ کر لیا، بہادر شاہ ظفر کو شہنشاہ تسلیم کر کے تخت پر بٹھا دیا گیا اکیس توپوں کی سلامی داغی گئی۔ ضعیف بادشاہ نے کرائی کی قیادت کرنا منظور کر لیا اور شہنشاہ ہند کی حیثیت سے انھوں نے پہلا فرمان جو جاری کیا، وہ تھا گائے نشی بند کرنے کا فرمان۔

تقریباً سارے شمالی ہند سے بناوٹ کی خبریں آنے لگیں۔ جھانسی میں عوام کب سے تیار بیٹھے تھے۔ صرف اشارے کی دیر تھی۔ کشنراکین کے جاسوسوں نے اسے خبر دی کہ جھانسی میں کسی بھی دن بناوٹ ہو سکتی ہے۔ عوام رانی کے حکم کے انتظار میں ہیں۔ راکین نے فوج کی نبض ٹٹولی۔ معلوم ہوا کہ فوج کے تمام ہند اور مسلمان سپاہی بھی منتظر ہیں کہ کب کچھ شروع ہو، کب انھیں رانی کا پکا سا اشارہ بھی موصول ہو اور وہ انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھالیں۔

راکین اور گارڈن سر جوڑ کر بیٹھے۔ مشورے ہوئے اور ایک منصوبہ کیا

کیا۔ راکین نے رانی سے ملاقات کی۔ ”رانی صاحب“ اس نے کہا ”ہمارے آداب قبول فرمائیے ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے آپ کے آرام میں خلل ڈالا..... لیکن ہمیں مجبور آپ کے پاس آنا پڑا..... گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے خاص طریقے سے ہمیں حکم بھیجا ہے کہ ہم خود آپ کی خیریت لینے اور آپ کی مزاح پر سی کرنے آپ کے پاس حاضری دیں۔“

”گورنر جنرل صاحب سے ہمارا دھنیہ واہ کھلوا دیجئے۔“ رانی نے پردے کے پیچھے سے کہا۔ ”ان سے کھلوا دیجئے کہ ہم کھیریت سے ہیں۔ پنشن سنے سے مل جاتی ہے۔“

”یقین کیجئے رانی صاحب کہ گورنر جنرل صاحب اور ہم صرف آپ کی خیریت چاہتے ہیں اور ہم گورنر جنرل صاحب کی طرف سے اور اپنی طرف سے بھی آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ آپ کو آپ کے خاندان کو کبھی کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔ ابھی گورنر جنرل صاحب کلکتہ میں زرا مصروف ہیں لیکن جلدی ہی وہ آپ کی خیریت معلوم کرنے جھانسی آئیں گے۔“

”میں بے حد آجہاری ہوں۔“ پردے کے پیچھے سے رانی کی آواز آئی۔ ”اور صرف یہی نہیں رانی صاحب“ راکین بولا۔ ”ہم نے سفارش کی ہے کہ آپ کی پنشن کو پانچ ہزار سے بڑھا کر دس ہزار کر دیا جائے۔ اور ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ گورنر جنرل صاحب نے ہماری بات سے اتفاق کرتے ہوئے سفارش کو کمپنی کے ڈائریکٹرز کے پاس انگلینڈ بھیج دیا ہے۔ امید ہے کہ چھ مہینے کے اندر انگلینڈ سے منظوری آجائے گی۔“

”بہت بہت دھنیہ واہ“ رانی کی آواز آئی ”میں اس کے علاوہ کیا کہوں کہ آپ لوگ بڑے دیالو (رحمدل) ہیں۔“

”بات یہ ہے رانی صاحبہ کہ ہم جھانسی میں امن چاہتے ہیں۔ ادھر شمالی ہند میں کچھ جگہوں پر کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے۔ لیکن ہم جھانسی میں ایسا نہیں



چاہتے۔“ اسکین نے کہا۔

”ہم بھی جھانسی میں شانتی چاہتے ہیں۔“ پردے کے پیچھے سے رانی کی آواز آئی۔ ”یہی بات جب ہم نے گورنر جنرل صاحب سے کہی تو انھوں نے فرمایا کہ ارے بھائی جھانسی میں رانی صاحب موجود ہیں۔ ان کے رتے تھیں فکر کرنے کی کیا ضرور ہے؟ انھوں نے مجھے حکم دے کر کہا..... تم فوراً رانی صاحب سے ملو..... تمھاری مشکل کا حل اگر کہیں ہے تو رانی صاحب کے پاس ہے۔ جیسا رانی صاحب کہیں دیا کرو۔ رانی صاحب خود کب چاہیں گی کہ جھانسی میں امانتی ہو؟“

رانی نے کہا ”میں واکھی جھانسی میں امانتی نہیں چاہتی۔ گورنر جنرل صاحب جج جج بہت بدھی مان ہیں۔“

اسکین بولا۔ ”وہ دل سے آپ کی عزت کرتے ہیں اور انھوں نے مجھ سے صاف لفظوں میں کہا ہے..... اسکین، تم خوش قسمت ہو کہ تم رانی صاحب سے اتنے قریب ہو ہم سب خوش قسمت ہیں، پوری انگریز قوم خوش قسمت ہے کہ اسے رانی صاحب جیسا ہمد اور عقلمند دوست ملا ہے۔ جب بھی تمھیں کوئی مشکل پیش آئے تم فوراً رانی صاحب سے ملو۔ وہ تمھاری مشکل دور کر دیں گی۔“

”دھنیہ واو۔“ رانی کی آواز آئی ”میں پوری کوشش کروں گی کہ اتنے اچھے لوگوں کی مشکلیں دور کر سکوں۔“

”شکریہ..... بہت بہت شکریہ رانی صاحب“ اسکین نے خوشی کا اظہار کیا ”ہمارے گورنر جنرل کا یہ خیال بالکل ٹھیک ہے کہ آپ بے حد مہمان ہیں.....“

ادھر ہمیں تھوڑی سی پریشانی ہے۔“

”کیسی پریشانی؟“ رانی نے پوچھا۔

”بات یہ ہے رانی صاحب کو ہماری فوج میں تھوڑی گڑبڑی ہے..... اسے تو ہم سنبھال لیں گے۔ بس ہم یہ چاہتے ہیں کہ جھانسی کے عوام سکون کے ساتھ رہیں اور کوئی گڑبڑ نہ کریں۔“ اسکین مطلب کی بات پر آگیا۔

رانی نے کہا ”مجھے بھی کھیریں مل رہی ہیں۔ سارے اتر بھارت میں امانتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ جھانسی میں بھی باہر کے لوگ آکر گڑبڑ پھلائیں گے۔ اب میرے پاس تو کوئی سینا ہے نہیں جس میں باہر کے لوگوں کا مقابلہ (مقابلہ) کروں اور انھیں جھانسی سے باہر ہی روکوں۔“

”اور ہم اپنی فوج پر ان حالات میں بھروسہ کر نہیں سکتے..... کیوں نہ آپ اپنی ایک فوج بتائیں؟“ اسکین نے مشورہ پیش کیا۔

”لیکن اس سے بھی کیا ہوگا؟“ رانی کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ ”جب تک جھانسی پر انگریزوں کا ادھیکار ہے ہمارے لوگ انگریزوں کے وچھاد کیسے ہو سکتے ہیں؟“

”تو ہم ایسا کرتے ہیں کہ جھانسی کا بندوبست آپکے ہاتھ میں دے دیئے ہیں۔“ اسکین نے کہا۔

”اگر ایسا ہو جائے تو میرے لوگ اور میرے دوار (ذریعے) بھائی گئی سینا میرا کہنا مانے گی اور امید ہے کہ پھر جھانسی میں کرائی نہیں ہوگی“

”بس تو ٹھیک ہے۔“ اسکین کھڑا ہو گیا۔ ”ہم آج ہی اعلان کروائے دیتے ہیں کہ جھانسی کا بندوبست رانی کشمی بانی کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے..... بس یہ دیکھ لیجئے کہ ہم جھانسی میں امن چاہتے ہیں۔ آپ کے اس دیل سے، اور خاص کر بندیل کھنڈ سے ہمیں بہت پیار ہے۔ ہم اس دیل کو اور اس مہمان بندیل کھنڈ کو تباہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔“

رانی نے کہا ”دھنیہ واو۔“

اور اسکین اپنی کامیابی پر دل ہی دل میں خوش ہوتا ہوا چلا گیا۔

اسے حالات کا اندازہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کانپور، دلی، میرٹھ اور اودھ کی خبریں جھانسی پہنچ رہی ہیں اور جب جھانسی پہنچ رہی ہیں تو رانی تک بھی پہنچ رہی ہوں گی۔ رانی نے ابھی گفتگو کے دوران خود ہی کہا تھا کہ اسے خبریں مل رہی ہیں کہ

سارے اثر بھارت میں اشانتی ہے۔ ان حالات میں جھانسی میں بھی کسی وقت بغاوت ہو سکتی ہے۔ وہ یہ بات بھی اچھی طرح سے سمجھتا تھا کہ صرف رائی ہی اس بغاوت کو روک سکے گی۔ اس لئے رائی کو شیشے میں اتارنا ضروری تھا۔ اپنے خیال میں اس نے رائی کو شیشے میں اتار بھی لیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ عیار کشتہ اسکیں کو رائی سے کوئی ہمدردی تھی نہ جھانسی سے۔ اس کا واحد مقصد جھانسی کی مکمل بغاوت کو پھوٹ پڑنے سے روکنا تھا، وہ بھی صرف اُس وقت تک کے لئے جب تک باہر سے انگریز فوج جھانسی پہنچ سکے۔ اور اس کے لئے اُسے وقت درکار تھا۔ اسے علم تھا کہ فی الحال کچھ ماہ تک کہیں سے بھی انگریز فوج کے جھانسی پہنچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ہر جگہ باغی..... انگریز فوج سے لوہا لے رہے تھے۔ دلی میں جرنل بخت خاں کی قیادت میں باغی فوجیں انگریزوں کا جینا حرام کئے ہوئے تھیں۔ اودھ میں مولوی احمد اللہ کی قیادت میں ہندوستانی فوجیں ہر جگہ انگریزوں کو ناکوں پہنے چہوڑ رہی تھیں۔ نواب برہمپور قادر اور بیگم حضرت محل لکھنؤ میں فرنگیوں کو ٹکٹے نہیں دے رہے تھے۔ الہ آباد، کانپور، مراد آباد، بخور، شاہجہاں پور، میرٹھ..... ہر جگہ باغی ہندوستانی انگریزوں پر دن رات قیامت توڑ رہے تھے۔ اسکیں یہ بھی جانتا تھا کہ اگر جھانسی میں کچھ شروع ہو گیا تو دتیا، گوالیار، مورینا، رائی، کالمپی، ستارا..... ہر جگہ بغاوت شروع ہو جائے گی، اور اس بغاوت سے نمٹنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو جائے گا۔ حالانکہ گوالیار کے سندھیا انگریزوں کے دوست ہی نہیں بلکہ انگریز پرست تھے، لیکن وہ نہ عوام میں مقبول تھے نہ عوام ان کی سنتے تھے۔ اور پھر اگر بغاوت ہوئی تو فوجی اور عوام اور دونوں ایک ساتھ بغاوت کریں گے۔ اسکیں یہ بھی جانتا تھا کہ جب عوام اور فوج دونوں ایک ساتھ بغاوت کرتے ہیں تو اس بغاوت سے نمٹنا بہت مشکل ہو جاتا ہے، اسے دبا کر قریب قریب ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس لئے وہ جھانسی کو ہر حال میں بغاوت سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ اسی لئے اس نے منصوبہ تیار کیا تھا، رائی سے ملاقات کی تھی اور اپنی سمجھ سے فوجوان رائی کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اسی شام اس نے اعلان کروادیا کہ جھانسی کا بندوبست کبھی بہادر نے رائی لکشمی بائی کے ہاتھ میں دے دیا ہے اور اب فوج جو کچھ بھی کرے گی رائی صاحبہ کے حکم سے کرے گی۔ عوام کے لئے احکامات جاری کروائے کہ عوام رائی لکشمی بائی صاحبہ کا حکم مانیں اگر کسی نے بھی رائی صاحبہ کی حکم عدولی کی تو اسے سخت سے سخت سزا دی جائے گی۔

عوام نے منادی سنی۔ خوشی کے نعرے لگائے۔

فوج نے منادی سنی۔ اپنی خوشی کو سینوں میں ہی دبا کر رکھا۔

ادھر رائی نے اپنے اہم ترین ساتھیوں کے ساتھ بیٹھک کی۔ اس بیٹھک میں دیوان جواہر سنگھ، کنور رگھوناتھ سنگھ، ناتا بیوپنکر، مورپنت، کنور خدا بخش، کنور غلام غوث خان، بھادو بخش، لالہ برہمن، سندربائی، مندر، کاش بائی، موتی بائی اور بانو جوبی کے علاوہ زماں خان، امیر خان اور کنور گل محمد شامل تھے۔

کنور گل محمد نے ایسا انتظام کیا تھا کہ اس بیٹھک میں کئے گئے فیصلوں کی بھنک بھی دیوان خاص سے باہر نہ جائے۔ رائی کے ارد گرد اور محل کے ارد گرد اس نے پہرہ بڑھا بھی دیا تھا اور اسے زیادہ جست اور زیادہ چوکنو بھی کر دیا تھا۔ پہرے پر صرف وہ لوگ رہتے تھے جن کی شجاعت، ایمانداری اور وفاداری کے بارے میں گل محمد کو سونی صدیقین ہو تا تھا، اور جن پر وہ آنکھ بند کر کے اعتماد کر سکتا تھا۔

بیٹھک کئی گھنٹے چلی، پھر سب چلے گئے اور سب نے طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنی اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

دوسرے دن سے ہی رائی کی فوج میں بھرتی شروع ہو گئی۔

جو ہندوستانی جھانسی میں موجود انگریزی فوج میں شامل تھے انھوں نے بھی رائی کی فوج میں بھرتی ہونے کا من بنالیا۔

فوج میں شامل ایک انگریز نے یہ خبر کیشن ڈنلپ تک پہنچائی۔ ڈنلپ ایک انگریز لیفٹیننٹ مورس ولیم کے ساتھ چھوٹی پہنچا۔ وہ بے حد غصے میں تھا، اس نے

سارے ہندوستانی سپاہیوں کو اپنے سامنے حاضر ہونے اور قطار بنا کر کھڑے ہونے کا حکم دیا۔

پانچ منٹ میں ہی سارے ہندوستانی فوجی چھادی کے کھلے صحن میں قطار باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

کیپٹن ڈنلپ دو منٹ تک ہونٹ پیچھے کھڑا ایک ایک کو گھورتا رہا۔ سب کے چہروں پر خوف تھا..... بناؤں خوف..... اور اس بناؤں خوف سے ڈنلپ دھوکا کھا گیا۔

”حرامی ہندوستانی“ وہ غرایا ”اگر کسی نے بھی یہاں سے جا کر رانی کا فوج میں شامل ہونے کا بات سوچا بی تو ہم اس کئے کو کاٹ کر رکھ ڈے گا۔“

”تم ہم کو حرامی بولا سفید سورا“ رسالے دار کالے خاں دہلڑا آگے بڑھا اور اس پہلے کہ کوئی کچھ سمجھ سکتا اس نے بدوق سیدھی کی اور کیپٹن ڈنلپ کو گولی مار دی۔ اس کے بعد اس نے بھاگتے ہوئے خوفزدہ سورا و لیم کو بھی گولی مار دی۔ دوسرے تمام ہندوستانی سپاہیوں نے بھی اپنی بدوق سیدھی کر لیں۔ چھادی میں موجود تمام انگریز فوجی بھاگ کھڑے ہوئے۔ رسالے دار کالے خاں اور اس کے تمام ہندوستانی ساتھی سپاہیوں نے جن جن کر انگریز فوجیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ جو انگریز جہاں نظر آیا، ڈھیر کر دیا گیا۔

کشمیر اسکیں اور ڈپٹی کشمر جگراڈن کے بنگلوں کو گھیر لیا گیا۔ لیکن چونکہ وہاں پہرہ بہت سخت تھا اس لئے ان دونوں تک باقی سپاہیوں کی رسائی نہ ہو سکی۔ کوئی فوجی دونوں میں سے کسی بھی جگہ میں داخل تک نہیں ہو سکا۔

تیسری رات اسکیں ہندوستانی فوجیوں کی آنکھ میں دھول جمو یک کر رانی کے محل میں پہنچ گیا۔ وہ بے حد غصے میں تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ موقع غصے کے اظہار کرنے کا نہیں ہے..... اسے نرمی، ہوشیاری اور مکاری سے کام لینا ہو گا۔

”مہارانی صاحبہ.....“ اس نے اپنی آواز میں گویا ساری دنیا کا دکھ سمو کر کہا ”ہمیں امید تھی کہ جھانسی میں کچھ نہیں ہو گا۔ لیکن کالے خاں نے جو کچھ کیا اس

کی اطلاع آپ کو مل چکی ہو گی۔“

”ہاں کشمر صاحبہ“ رانی نے پردے کے پیچھے سے کہا ”ہمیں اطلاع مل چکی ہے۔ جھانسی میں ہر ویکتی میری بات مانتا ہے..... لیکن کوئی انگریز اگر سارے ہندوستانیوں کو حرامی کہہ کر پکارے گا تو پھر توہ کوئی برداشت کرے گا نہ اس سلسلے میں میری بات سنے گا۔ میری کیا، کسی کی بات نہیں سنے گا۔ ہندوستانیوں کی رگوں میں بیٹے والا کھون ابھی تک کھون ہی ہے۔ پانی نہیں ہو گیا ہے۔“

”ہم جانتے ہیں مہارانی صاحبہ، ہم جانتے ہیں“ اسکیں جلدی سے بڑی ستانت اور بڑے خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ ”ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہندوستانی بڑے خوددار اور بڑی غیرت والے لوگ ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم ان کی بے حد عزت کرتے ہیں۔ کیپٹن ڈنلپ نے بڑے غلط لفظ کا استعمال کیا، اور اس کی اسے بڑی مناسب سزا ملی، ہم خوش ہیں۔ اور اب چونکہ مجرم کو سزا مل چکی ہے اور اسے موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے اس لئے مہارانی صاحبہ سے ہماری گزارش ہے کہ رسالے دار کالے خاں کو روکا جائے۔ وہ اور اس کے ساتھی پاگل ہو رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے.....“ رانی کی آواز آئی۔ ”میں کو شش کوئی ہوں۔“

”بہت بہت شکریہ مہارانی صاحبہ بہت بہت شکریہ۔“ اسکیں گویا سراپا سپاس ہو گیا ”ہم جانتے ہیں کہ آپ بے حد نرم دل اور انتہائی مہربان ہیں۔ ایک گزارش اور ہے۔ کالے خاں اور اس کے ساتھیوں سے انگریز عورتوں اور بچوں کی خاص طور سے حفاظت کی جائے۔“

”کیا رسالے دار کالے کھان یا اس کے ساتھی نے..... یا کسی ہندوستانی نے اب تک کسی انگریز عورت یا کسی انگریز بچے کو کوئی ٹکسان (نقصان) پہنچایا ہے؟“ رانی نے سوال کیا۔

”ابھی تک تو کسی بھی انگریز عورت یا انگریز بچے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے، لیکن غصہ بڑی خراب چیز ہوتی ہے۔ طیش میں آکر آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے اس

لے ہماری گزارش ہے کہ انگریز عورتوں اور بچوں کی حفاظت کی ذمہ داری مہارانی صاحبہ لے لیں۔ ”اسکین کی آواز میں التجا تھی۔

”میں کل صبح ہی بندوبست کرتی ہوں۔“ رانی نے کہا اور بولی ”مجھے آج ہی یہ بھی پتہ چلا ہے کہ کالے خاں کے ساتھیوں نے آپ کا اور گارڈن صاحب کا ہنگامہ گھیر رکھا ہے۔ میں انھیں یہ گھیرا ختم کرنے کا حکم بھی بھجوا رہی ہوں۔“

”ہم نے غلط تو نہیں کہا تھا کہ ہماری مہارانی صاحبہ نہایت رحم دل اور انتہائی مہربان ہیں؟“ اسکین نے بے حد مسرت کا اظہار کیا اور اجازت لے کر چلا گیا۔

کالے خاں اور اس کے باقی ساتھیوں کے خوف سے جھانسی کے تمام انگریزوں کی نیندیں حرام تھیں۔ سبھی انگریز اپنے اپنے بنگلوں میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ کوئی بھی انگریز مرد، عورت یا بچہ نہیں نکلتا تھا۔

رانی نے دوسری صبح ہی زماں خاں کو بھیج کر کالے خاں سے اسکین اور گارڈن کے بنگلوں کا محاصرہ ختم کرنے کے لئے کہلوایا۔

رسالے دار کالے خاں نے بغیر سوال کئے، بغیر کسی جیل جت کے دونوں بنگلوں سے محاصرہ اٹھالیا۔ کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا۔ دل میں چاہے کسی نے کچھ بھی سوچا ہو کہ زبان سے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ رانی کا لفظ ان سب کے لئے قانون تھا۔

اس کے بعد رانی نے جھانسی میں موجود تمام انگریز عورتوں اور انگریز بچوں کو قلعے میں بلوایا۔ کیونکہ یہ لوگ صرف وہاں ہی محفوظ رہ سکتے تھے۔ ان کی حفاظت کی ذمہ داری بھی رانی نے کنور گل محمد کے سپرد کر دی۔ گل محمد نے حسب عادت بغیر کوئی تبصرہ کئے، بغیر کوئی سوال کئے، بغیر ایک لفظ بھی منہ سے نکالے یہ نئی ذمہ داری بھی قبول کر لی اور بندوبست شروع کر دی۔ جس سے میں انگریز عورتیں اور بچے تھے اس حصے میں بھی گل محمد نے سخت پہرہ لگا دیا۔ صرف وہی ملازمین قلعے کے اس حصے میں انگریز عورتوں اور بچوں کا تاشہ کھانا اور ضرورت کا دوسرا سامان لے کر جا سکتی تھیں جنھیں گل محمد اس کام پر مامور کرتا۔

تیسرے دن کچھ انگریز عورتوں نے اس حصے سے نکل کر قلعے اور محل میں گھومنے پھرنے کی خواہش کا اظہار کیا، بلکہ کچھ عورتوں نے نکلنے کی کوشش بھی کی۔ پہرے داروں نے انھیں روکا۔

اطلاع گل محمد کے پاس پہنچی۔

گل محمد فوراً قلعے کے اس حصے میں پہنچا جس میں انگریز عورتیں اور بچے رکھے گئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی ساری انگریز عورتیں اور بچے خاموش ہو گئے۔ پہلی بار قلعے میں کوئی مرد ان کے سامنے آیا تھا۔

”امارا تم گل محمد ایسے..... کنور گل محمد خان“ گل محمد کی بھاری بھر کم آواز اس کے منہ سے نہیں، گویا سوچے وجود سے نکلی۔ ”امارا بات سنو..... اور غور سے سنو..... تم ایک مکار قوم کا افراد ایسے..... کمینہ قوم..... خالہ قوم..... ام تمہارا قوم کا کٹر دشمن ایسے اور تمہارا ذلیل قوم کو اپنے اس مقدس ملک سے نکالنا امارا زندگی کا مقصد ایسے۔ ام اپنا مقصد حاصل کرنے کا واسطے زندگی کا آخری سانس تک کوشش کرتا رہے گا..... مگر تم فرنگی بچہ وزن اور امارا رانی ساب کا مہمان ایسے..... تمہارا حفاظت ام پر فرض ایسے۔ ام اپنا فرض پورا کرے گا۔ تم کو اور کوئی گریز نہیں پونے گا..... بے فکر او کر دو..... لیکن اگر تم میں سے کسی نے اس حصہ سے نکلنے کا کوشش کیا تو امارا پیرے دار تم کو گولی مار دے گا۔ قلعے کا یا محل کا جاسوسی کرنے کا کردہ خیال اپنا دل سے نکال دو۔ ام جانتا تم لوگ کتنا مکار ایسے۔ اپنا مکاری اور میں نہیں چلاؤ ورنہ ام بول جائے گا کہ تم امارا مہمان ایسے۔“

اتنا کہہ کر وہ کسی سے بات کئے بغیر، کسی کو کچھ کہنے کا موقع دئے بغیر ایک جھپٹکے سے گھوم اور چلا گیا۔

وہاں سے وہ سیدھا رانی کے پاس پہنچا اور انھیں بتایا کہ وہ کیا کر آیا ہے۔

”تم نے ٹھیک کیا کنور گل محمد۔ تمھاری جگہ میں ہوتی تو میں بھی یہی کرتی۔ ہم نے اپنے دشمن کی عورتوں اور بچوں کو پناہ دی ہے، لیکن ہم انھیں یہاں محل میں انھیں

اپنے کھلاف جاسوسی کرنے کی اجازت) نہیں دے سکتے۔ تم نے بالکل ٹھیک کیا۔۔۔۔۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انگریز عورتیں ان عورتوں کو لالچ دے کر محل کے بارے میں جانکاری لینے کی کوشش کریں جو ان کے لئے کھانا تاشے لے کر جاتی ہیں۔ دلااری کی گھٹنا کے بعد میرے لئے کسی بھی نوکرانی پر دشواری کا مشکل ہو رہا ہے۔“

”آپ نے بالکل صحیح فرمایا ہے بارانی ساب۔ ام کو اس کا پہلے ہی خیال تھا۔ اس واسطے ام بہت سوچ سمجھ کر ان عورتوں کا انتخاب کیا ہے جو انگریز عورتوں اور بچوں کا واسطہ تاشے، کھانا ضرورت کا دوسرا سامان لے کر جاتا اور ب نولادی بندیل عورتیں ہیں۔ تاہم ام ان سب کو سختی سے تاکید کیا کہ اوکسی انگریز عورت یا بچے کے کسی سوال کا جواب نہیں دے، خود کوئی بات نہ کرے اور اگر کوئی انگریز عورت یا بچہ کسی سے محل، قلعے، مارانی ساب یا مارانی ساب کے کسی ساتی (ساتھی) کے متعلق کچھ پوچھے تو فوراً ام کو مطلع کیا جائے۔“

”شاباش گل۔ تم واکی سمجھدار ہو۔“ رانی اسے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئی بولی۔

”ام بے حد ممنون اے بارانی ساب کا۔ مارانی ساب کا ستائش کا ایک لفظ امارا حوصلہ میں سوگنا اضافہ کر دیتا۔“ گل محمد کی آواز میں احسان مندی کی بڑی والہانہ چمک تھی۔

”کنور گل محمد“ رانی نے بات بدلی۔ ”کراختی کا دن ۳۱ مئی طے کیا گیا تھا۔ لیکن ہر جگہ سمنے سے پہلے ہی کچھ نہ کچھ شروع ہو گیا۔ یہاں جھانسی میں ابھی کچھ دن تک کچھ نہیں چاہتی تھی۔ کم از کم اس سمنے تک جب تک میرے پاس ایک بڑی سی تیار نہیں ہو جاتی۔ لیکن کالے کھانے شروع کر دیا۔“

”مارانی ساب“ گل محمد نے اپنی پتھریلی آواز میں بولا۔ ”کالے خاں یا اس کے ساتھیوں کو اب رد کا نہیں جاسکتا۔ ملٹون انگریزوں نے صرف اسے ہی نہیں سارا ہندوستان کو گالی دیا۔۔۔۔۔ حرامی ہے!۔۔۔۔۔ ایک پھانچا یہ گالی نہ اپنا واسطے برداشت

کر سکتا، نہ اپنا ساتیوں (ساتھیوں) اپنا ہم وطنوں کا واسطے۔ کالے خاں کے مقام پر ام او تا تو ام بی بی کرتا۔“

”میں جانتی ہوں۔۔۔۔۔“ رانی بڑی اپنائیت بھرے یقین کے ساتھ بولی ”میں جانتی ہوں کہ پھانچا بڑی آن والے لوگ ہوتے ہیں۔ حالانکہ رسالے دار کالے کھان نے سمنے سے پہلے جو کچھ شروع کر دیا وہ مجھے پسند نہیں آیا کیونکہ یہ یو جتا (منسوب) کے کھلاف تھا، پھر بھی مجھے کالے کھان سے کوئی شکایت نہیں۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔“

گل محمد نے کہا ”ام کو کوشش کرنا ہے۔“

لیکن گل محمد کو کوشش کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اگلے روز رسالے دار کالے خاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ خود ہی رانی کے پاس آیا۔ اور سلام کر کے بولا ”مہارانی صاحبہ کی بے ہو۔ خادم کے پاس دلی سے جزل بخت خان کا سندیرہ آیا ہے۔ انھوں نے خادم کو دلی بلایا ہے انھوں نے کہلوایا ہے کہ مہارانی صاحبہ کے پاس تو جواہر سنگھ، رمگھو تا تھ سنگھ، بھادو بخشی، پورن، زماں خان، غلام غوث خان اور گل محمد جیسے سورا موجود ہیں، اس لئے میں دلی چلا آؤں تاکہ جزل بخت خان کو میری خدمات حاصل ہو سکیں اور بادشاہ سلامت کی فوج اور مضبوط ہو سکے۔ اس لئے مہارانی صاحبہ آپ کا یہ خادم آپ سے اجازت لینے حاضر ہوا ہے۔ یہاں جھانسی میں فی الحال کرنے کے لئے کچھ خاص نہیں ہے، اس لئے اگر خادم کو دلی جانے کی اجازت دے دی جائے تو خادم کی خدمات دلی کو حاصل ہو جائیں گی۔“

”ٹھیک ہے کالے کھان۔ دلی سدھارو۔ بھگوان تمھاری رکشا کریں۔ بات اگر انگریزوں کو دیش سے نکالنے کی نہ ہوتی میں اپنی جھانسی کے اس جھینے کو جھانسی سے باہر نہ جانے دیتی۔“ مہارانی نے اپنے گلے سے لکھٹھ مالا اتار کر کالے خاں کے ہاتھ پر رکھی اور بولی۔ ”انگریزوں نے میرے پاس چھوڑا ہی کیا ہے۔۔۔۔۔ یہ ایک لکھٹھ مالا بچی ہے۔ اسے لے جاؤ۔ اسے بچ کر اپنا اور اپنے ساتھیوں کا دلی کے راستے کا کھرچ

## نواں باب

جھانسی کے وہ دن بڑے جو شیلے، بڑے ہلچل بھرے، بڑے معروف دن تھے۔ جھانسی کے باشندوں کو یقین تھا کہ جلد ہی انھیں انگریزوں سے دودھاتھ کرنے کا موقع ملے گا۔ ان کی رانی ایک بار پھر حکمران ہو گئی تھی، فرمانروا بن گئی تھی۔ جلدی ہی رانی کے پاس اچھی خاصی فوج ہو گئی۔ فوراً ہی اس نے نیا نظام قائم کیا۔ لکشن راؤ کو اپنا پردھان منتری اور دیوان جواہر سنگھ کو پردھان سینا پتی مقرر کیا۔ پوری پیدل فوج کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصے کا سالار کرنل دیوان رگھو ناتھ سنگھ کو، دوسرے حصے کا سالار کرنل محمد زباں خان کو اور تیسرے حصے کا سالار کرنل کنور خدا بخش کو مقرر کیا۔ گھوڑ سوار فوج کی سپہ سالار خود رانی تھی، کرنل سندربائی، کرنل مندر بائی کا شئی بائی کو اس نے اپنا نائب مقرر کیا۔ توپ خانہ کنور غلام غوث خان کے سپرد کر کے دولہا جو اور لالتا برہمن کو اس کا نائب مقرر کیا۔ جاسوسی کا محکمہ موتی بائی کی ماتحتی میں دے کر بانو جوہی کو اس کی نائب مقرر کر دیا۔

اس دوران قرب و جوار کے بہت سے لوگ آکر رانی کی فوج میں شامل ہو گئے تھے اور برابر ہو رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں اس ملک سے پیار تھا اور جو انگریزوں کو ملک سے نکال باہر کرنا چاہتے تھے۔ رانی کی فوج میں بھرتی ہونے والے ان لوگوں میں ہندو بھی تھے، مسلمان بھی تھے۔ یہ سب بھوکے پیاسے لوگ تھے۔ لیکن یہ پیٹ کی خاطر رانی کی فوج میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ انگریزوں سے دودھاتھ کرنے کے لئے شامل ہوئے تھے۔

چلا تا۔ لیکن دیکھو..... دو سو کوں کی یا ترا ہے۔ اپنا اور اپنے ساتھیوں کا کھیاں رکھنا..... تم سب کو چندہ (زندہ) دلی پہنچنا ہے اور دلی کی سینا میں شامل ہو کر انگریزوں سے یدھ کرتا ہے اور انھیں دیش سے باہر نکالنا ہے..... اپنے شریہ کے کھون کی ایک ایک بوند دیش پر نچھاور کر دینا..... اور ایک بات اور یاد رکھنا..... راستے میں کسی کو تنگ نہ کرتا..... ستا مات..... میں جانتی ہوں کہ تم انگریزوں کے جانی دشمن ہو اور کوئی انگریز تمھیں اندھیرے اجالے مل جاتا ہے تو تم اس کا کام تمام کر دیتے ہو..... لیکن راستے میں اگر کوئی انگریز عورت مل جائے یا کوئی انگریز بچہ مل جائے تو اسے نہ لوٹنا، نہ مارنا..... یاد رکھنا ہم بھارتیہ ہیں۔ عورتوں اور بچوں کی حفاظت (حفاظت) کرنا ہمارا دھرم ہے..... پنجان کو م کو اہانت (بے عزت) نہ کرنا، دیش کا سر نیچا نہ کرنا، اپنی رانی کو شرمندہ نہ کرنا۔“

”ایسا کچھ کرنے سے پہلے میں مر جانا پسند کروں گا مہارانی صاحبہ“، کالے خاں کا لہجے میں چٹان جیسی مضبوطی تھی..... ”مہارانی صاحبہ کا حکم اس جاں نثار کے لئے بھڑکی لکیر ہے۔“

”جاؤ..... سید حارث“ کہہ کر رانی نے ہونٹ بھیج لئے۔

”مہارانی صاحبہ! سپندہ باد..... انگریز فرنگی کا منہ کالا“ کالے خاں نے رانی کو فرشی سلام کیا۔ لٹے قدموں پیچھے ہٹا، ایک نگاہ اس نے رانی پر ڈالی اور پلٹ کر جلدی سے چلا گیا۔

سارا سارا دن ان کی تربیت کا کام چلتا رہتا۔ یہ تربیت امیر خان، دیون کرمل جواہر سنگھ، کرمل رگھو ناتھ سنگھ، کرمل زماں خان، مسندر بائی، مندر بائی، کاشی بائی اور خود رانی کی دیکھ ریکھ میں ہوتی تھی۔

جہانسی کا بندوبست ہاتھ میں آتے ہی رانی کی ذمہ داریوں میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ جلد از جلد ایک بڑا اور تربیت یافتہ لشکر کی تشکیل چاہتی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کے ہاتھ میں جہانسی کا بندوبست دینا انگریزوں کی چال ہے اور ایسا انھوں نے ایک منصوبے کے تحت کیا تھا۔ اسکیں کو صرف اتنا وقت درکار تھا کہ کہیں سے بھی انگریز کی فوج جہانسی پہنچ جائے اس کے بعد وہ جہانسی کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ یقیناً وہ کیپٹن ڈنلپ، مورس ولیم اور دوسرے انگریزوں کا بھولانہ ہو گا۔

بہر حال ہر طرف یہ خبر پھیل گئی کہ جہانسی میں حالات بدل گئے ہیں۔ انگریزوں کا عمل ختم ہو گیا ہے اور رانی کشمی بائی جہانسی کی حکمران ہو گئی ہے۔ عوام نے اپنے گھروں میں چراغاں کیا۔ مضامیناں تقسیم کی گئیں۔ لیکن جلد ہی ان نئے حالات کے منفی اثرات سامنے آنے لگے۔ جو لوگ دل ہی دل میں رانی کے خلاف تھے وہ سرائے اٹھانے لگے۔ خوف انھیں ایسٹ انڈیا کمپنی سے تھا، انگریزوں سے تھا، بانیس برس کی ایک بیوہ اور لاولد عورت سے یا اس کی چھوٹی سے اس فوج سے نہیں تھا۔ جو ابھی تشکیل کے مراحل سے گزر رہی تھی۔

ان نئے حالات کا ایک مثبت پہلو بھی اس طرح رانی کے سامنے آ جا کر ہو گیا..... نیک دل رانی کا یہ بھرم ٹوٹ گیا کہ جہانسی ہی نہیں، پورے ہندیل کھنڈ کا بچہ بچہ اس کا وفادار ہے۔ ان نئے حالات نے اپنے پرانے اور دوست دشمن سبھی کی اصلیت کو رانی کے سامنے عیاں کر دیا تھا۔

سب سے پہلا سر جو رانی کشمی بائی کے سامنے اٹھا وہ تھا سدا شوراؤ نیوا نکر کا۔ وہ جہانسی کی گدی کا دعوے دار تھا۔ اسے علم تھا کہ رانی کی فوج میں ابھی تو بھرتی ہی چل رہی ہے..... ابھی تو فوج کی تشکیل ہو گی، پھر تربیت ہو گی، ور سالے نہیں

گئے، عہدوں کی تقسیم ہو گی۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ انگریزوں نے تین سال قبل جہانسی کا توپ خانہ برباد کر دیا تھا، کچھ توپوں کو زمین میں دفن کر دیا تھا اور باقی کو کیلیں ٹھونک کر تباہ کر دیا تھا۔ اور نیا توپخانہ ایک دن میں یا ایک ہفتے میں یا ایک مہینے میں یا ایک سال میں تیار نہیں ہو جاتا۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ غلام غوث خان نے دن رات محنت کر کے توپخانے کو کار آمد کر لیا تھا۔ کنور گل محمد نے پہرہ اتنا سخت کر دیا تھا اور چوکی میں اتنا اضافہ کر دیا تھا کہ محل تو محل قلعے تک کی کوئی خبر باہر نہیں جاتی تھی۔ اس لئے سدا شوراؤ نیوا نکر کی جو بھی معلومات تھیں ناقص تھیں۔ اس نے سوچا کہ اگر اس نے فوج اکٹھی کر کے جہانسی پر حملہ کر دیا تو بڑی آسانی سے وہ رانی کو شکست دے کر جہانسی کے تخت پر قبضہ کرے گا۔

وہ جہانسی سے نکل گیا۔ جہانسی کے گرد و نواح کے تمام گاؤں بغاوت کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ وہ رانی کے حکم اور بلاوے کا انتظار کر رہے تھے۔ سدا شوراؤ نیوا نکر نے یہ تاثر دیا کہ وہ رانی کی طرف سے آیا ہے تاکہ ایک بڑی اور مضبوط فوج کی تشکیل کر کے جہانسی کی طرف کوچ کرے۔

بچا سوں بھولے بھالے دیہی جوان اس مغالطے میں اس کی فوج میں شامل ہو گئے کہ وہ رانی کی فوج میں شامل ہو رہے ہیں۔ یہ نوجوان صرف بھولے بھالے ہی نہیں تھے، بلکہ بھوکے بھی تھے، ہر عیش سے ہمیشہ دور رہے تھے۔ سدا شوراؤ نیوا نکر نے ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ انھیں بہترین کھانا، روپیہ اور شراب دے دے کر ان کے ہونٹوں پر اس نے صرف تالے ہی نہیں ڈال دے بلکہ اپنا وفادار بھی بنالیا۔ اس نے ان لوگوں کو وہ عیش کرائے کہ انھوں نے اسے خاموشی سے ”مہاراجہ دھراج“ تسلیم کر لیا۔ اب وہ دن رات اپنی فوج میں اضافہ کرنے کے کام میں جٹ گیا۔ وہ کچا کام نہیں کرتا چاہتا تھا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ جلد از جلد ایک بڑی اور مضبوط فوج بنا کر جہانسی پر حملہ کرے تاکہ پہلے ہلے میں ہی وہ رانی کو شکست دے کر جہانسی پر قبضہ کر لے۔ اُس کے بعد انگریزوں کی بلا دہستی تسلیم کر کے وہ جہانسی پر

حکومت کرتا رہے گا۔

موتی بائی نے یہ خبر رانی کو دی۔

رانی خبر سن کر بھونچ کر رہ گئی۔ پھر دھیرے دھیرے اس کے چہرے پر حیرت کی جگہ دکھ عیاں ہوتا چلا گیا۔ اس کو دکھ اس بات کا نہیں تھا کہ کوئی اس کے خلاف بغاوت کر رہا ہے، یا کوئی اس کا دشمن ہے، یا کوئی اسے نیست و نابود کر دینا چاہتا ہے۔ رانی کا دکھ یہ تھا کہ اس کی اپنی جھانسی کا ہی ایک شخص اس کے خلاف بغاوت کر رہا ہے، اس کی اپنی جھانسی کا ہی ایک فرد اس کا دشمن ہے، اس کی اپنی جھانسی کا ہی ایک باشندہ اسے نیست و نابود کر دینا چاہتا ہے۔ اسے گل مجاہد آیا جس نے اپنا بچہ کا کچھ بہم سداور کچھ واضح سا اظہار کیا تھا کہ ”کچھ اور ہے۔“

بات سامنے آگئی۔

غیروں کی غدار ی ذہنی کو فت میں مبتلا کرتی ہے۔

اپنوں کی غدار ی روحی اذیت میں مبتلا کرتی ہے۔

رانی کو روحی اذیت پہنچی۔

اس کا بھرم ضرور ٹوٹ گیا تھا مگر وہ خود ٹوٹنے کے لئے نہیں بنی تھی۔ اس نے بیشک طلب کی جس میں صرف خاص لوگوں کو بلایا۔

بیشک کئی گھنٹے چلی۔ کئی بے حد اہم فیصلے کئے گئے، ایک پورا لائحہ عمل تیار کیا گیا اور اس پر فوری طور سے عمل شروع کر دیا گیا۔

قلعے کی حفاظت غلام غوث خان، لالہ، برہمن اور بھاء بخشی کو سونپ کر رانی نے کرنل خدا بخش کو شہر کے جنوبی حصے کی دیواروں اور گھوڑا تھ سنگھ کو شمالی حصے کی اور کرنل زماں خان کو مغربی حصے کی حفاظت پر مامور کیا اور خود اپنی چھوٹی سے فوج لے کر راتوں رات کرایا کی طرف چل پڑی۔ اس چھوٹی سے مگر پوری طرح سے تربیت یافتہ فوج کی قیادت رانی خود کر رہی تھی۔ اس کی سہیلیاں کرنل سندربائی، رمل مندر بائی، اور کرنل کاشی بائی اس کے ساتھ تھیں۔ رانی کے گھوڑے کی داہنی طرف کنور

گل محمد کا گھوڑا تھا اور بائیں طرف اس کے ایک معتد صمد خان کا گھوڑا تھا۔ رانی کے گھوڑے کے ایک دم پیچھے گل محمد کے ایک اور معتد شاہ کر شو بھاسنگھ کا گھوڑا تھا۔

کرنل خدا بخش دیواروں اور گھوڑا تھ سنگھ اور کرنل زماں خان سبھی نے رانی سے التفات کی تھی کہ انھیں سدا شور او کی سرکوبی کیلئے بھیجا جائے۔ اتنے معمولی سے کام کیلئے رانی خود نہ جائے۔ لیکن ذہین رانی نے ان تینوں سپہ سالاروں کی التجاؤں کو بڑی نرم سختی سے ٹھکرایا۔ اس نے کسی سے کہا نہیں لیکن واقعہ یہ تھا کہ سدا شور او کی سرکوبی کیلئے وہ خود اس لئے جاری تھی کہ صرف سدا شور او ہی نہیں بلکہ اس کے ہر باغی، اس کے ہر دشمن اور ہر شخص کو یہ علم ہو جائے کہ رانی کو کنور و سمجھنا حماقت ہے۔ اپنا حوصلہ اپنی ہمت، اور اپنی شجاعت دکھانے کا یہ بہت اچھا موقع تھا، اور وہ اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔۔۔۔۔ دنیا کو اب تک اس کی عمر کا یہ تھا، اب دنیا کو اس کی اصلیت کا اندازہ ہو جانا چاہئے۔ کنور گل محمد پہلا شخص تھا جس نے رانی کی تائید کی تھی۔۔۔۔۔ جب رانی نے اس کی طرف دیکھ کر اس کی رائے مانگی تو اس نے بڑے مضبور لہجے میں کہا تھا ”انار خیال یہ ہے کہ سدا شور او باغی کا سرکوبی کا واسطے مارانی سب کو خود جانا چاہئے۔ اور اپنا زمانہ سپہ سالاروں کو اپنا سناٹا لے جانا چاہئے۔“ رانی طے تو کر ہی چکی تھی، گل محمد کی بات سے اس کے خیال کو تقویت حاصل ہوئی۔۔۔۔۔ جواہر سنگھ اور بھاء بخشی کی اس رائے سے رانی نے اتفاق کر لیا تھا کہ کنور گل محمد رانی کے ہمراہ جائیں گے اور رانی کی حفاظت کے لئے جسے بھی وہ چاہیں ساتھ لے لیں۔ کنور گل محمد نے صمد خان اور شاہ کر شو بھاسنگھ کے نام تجویز کئے جنہیں جواہر سنگھ اور خود رانی نے فوراً منظور کر لیا۔۔۔۔۔ اور اب رانی کرایا کے ساتھ دور اتوں رات کر رہا پہنچی۔ کرایا کے قلعے میں

طوفان کی سی تیزی کے ساتھ دور اتوں رات کر رہا پہنچی۔ کرایا کے قلعے میں سدا شور او اپنی خوابگاہ میں گہری نیند میں سویا ہوا تھا۔ پہرے داروں کی چیخ پکار اور بھاگ دوڑ سے اس کی نیند ٹوٹی اور وہ خوابگاہ سے باہر آیا اور جب اس نے قلعے کو گھرا ہوا اور خود رانی لکشی بائی کو اپنی فوج کی قیادت کرتے دیکھا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول



گئے۔ اسے کچھ بھی کرنے کا موقع نہیں ملا۔ رانی کی فوج کے سپاہی اس کی فوج کے سپاہیوں کو چن چن کر مار رہے تھے۔

اس نے پورے چاند کی روشنی میں رانی کی فوج کی غور توں کو تلوار چلاتے، دیکھا رانی کی فوج کے پٹھان اور ہندیلے سپاہیوں کو تلوار چلاتے دیکھا، خود رانی کو تلوار چلاتے دیکھا اپنے آدمیوں کو ایک ایک کر کے گرتے دیکھا..... اور پھر قلعے کے چور دروازے سے فرار ہونے میں ہی اسے اپنی سلامتی نظر آئی۔

رانی اپنے مخصوص ساتھیوں کے ساتھ جب قلعے کے اس حصے میں داخل ہوئی جس میں سدا شور اڈو انڈو اکر قیام پذیر تھا تو تین خوفزدہ اور دہشت زدہ ملازموں کے سوا اسے کوئی نہ ملا۔ یہ تین ملازم بھی فوجی ہی تھے۔ اور پوری طرح سے سدا شور اڈو کے وفادار تھے۔ رانی اور اس کے ساتھیوں پر انھوں نے تلواریں نہیں اٹھائیں..... ہاتھ جوڑ کر ان کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

رانی اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں میں برہنہ شمشیریں تھیں جن پر سدا شور اڈو کے فوجیوں کا خون تھا۔

رانی ان تینوں ملازموں کو کچھ دیر خوشخوار نظروں سے گھورتی رہی پھر درشت لہجے میں اس نے پوچھا۔ ”سدا شور اڈو کہاں ہے؟“

”مہارانی جی، ہمیں نہیں معلوم“ ان میں سے ایک نے ڈری ڈری سہمی آواز میں جواب دیا۔

”مارانی ساب، اگر اجازت او تو ام دریافت کرے؟“ رانی کے پیچھے کھڑے گل محمد نے اجازت طلب کی۔

رانی نے ایک لمحہ سوچا پھر پیچھے ہٹتی ہوئی بولی ”پوچھو۔“

گل محمد آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی خون سے تر تلوار تھی۔ اس نے ایک لمحہ اپنی تلوار کو دیکھا پھر اپنی جلتی ہوئی سی آنکھوں سے اس ملازم کو گھورنے لگا جس نے کہا تھا ”مہارانی جی ہمیں نہیں معلوم“ اس ملازم کی نگاہیں جھک گئیں۔ شاید

گل محمد کی خون جیسی سرخ آنکھوں کی تاب نہ لاسکا تھا۔ گل محمد نے بے حد سر دلہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ”مارانی ساب جانا چاہتا کہ سدا شور اڈو کدراوتا۔“

”مجھے نہیں..... م..... ہالم کھان ساب“ اس ملازم نے ہکلا کر کہا..... اور گل محمد کے تلوار والے ہاتھ کو جنش ہوئی۔

بڑی کر بناک چیخ ملازم کے حلق سے نکلی..... گل محمد کی تلوار اس کے سینے سے گزر کر پشت سے باہر آگئی تھی۔ گل محمد نے تلوار اس کے سینے سے کھینچی۔ زخم سے بڑی تیزی سے خون باہر آیا اور ملازم زمین پر گر پڑا۔ صرف چند لمحے وہ تڑپا، پھر ٹھنڈا ہو گیا۔

گل محمد نے دوسرے ملازم کو مخاطب کیا۔ ”مارانی ساب جانا چاہتا ہے سدا شور اڈو کدراوتا۔“

”م..... میں..... کھان.....“ ملازم ہکلیا..... اور جواب کا انتظار کئے بغیر گل محمد نے اپنی تلوار اس کے سینے میں بھی اتار دی..... اسی طرح تلوار اس کے سینے سے بھی گزر کر اس کی پشت سے نکل گئی تھی۔ اس کے حلق سے بھی ایک کر بناک چیخ نکلی۔ گل محمد نے تلوار اس کے سینے سے نکالی۔ اس کے زخم سے بھی خون کا فوارہ چھوٹا، وہ بھی گرا، چند لمحے تڑپا، پھر وہ بھی ٹھنڈا ہو گیا۔

گل محمد نے تیسرے ملازم کی طرف دیکھا، مگر اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ملازم کانپتی ہوئی آواز میں بولنے لگا..... م..... مجھے..... مدت مارے گا سر کار کھان بہادر صاحب جی..... ماراجہ دھیراج اس چور دروازے سے نکل کر گئے ہیں..... وہ زور جائیں گے..... ہم لوگوں کو وہیں بلا گئے ہیں۔“

”خزین کا اولاد..... غدار..... مارانی ساب کا موجودگی میں تو اس غدار ملعون سدا شور اڈو کو مارا جا دیراج بولتا اڈو“ گل محمد دہاز اور اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھ سکا گل محمد نے اپنی تلوار سے ملازم کا سر دھڑ سے الگ کر دیا۔

رانی نے اپنے چار سپاہی قلعے میں چھوڑے اور باقی فوج کے ساتھ اُس نے صبح

دس بجے ضرور کی طرف کوچ کر دیا۔ اُس کی فوج کا ایک سپاہی بھی کم نہیں ہوا تھا، کوئی زخمی تک نہیں ہوا تھا۔ حملہ اُس نے اتنی خاموش تیزی اور اتنا چابک کیا تھا کہ سدا شوراؤ کے سپاہیوں اور پہرے داروں کو نہ کچھ سمجھنے کا موقع ملتا نہ کہنے کا۔

رانی کے تمام ساتھی فوج کے ہمراہ فوراً ہی رات میں ہی ضرور کی طرف کوچ کرنا چاہتے تھے۔ فوج بھی یہی چاہتی تھی، لیکن رانی نے تھکی اور رات بھر کی جاگی فوج کو چھ گھنٹے آرام کرنے کا حکم دیا۔

دس بجے تازہ دم ہو کر اور ناشتہ کر کے فوج ضرور کی جانب روانہ ہو گئی۔ دن میں ایک بجے ایک بڑے باغ میں رہتی نے فوج کو رکے کا حکم دیا۔ فوج کو رانی کا یہ حکم اچھا نہیں لگا۔ وہ جلدی سے جلدی ضرور پہنچ کر سدا شوراؤ کو سزا دینا چاہتی تھی۔ مگر رانی کے حکم پر کسی نے بھی لب کشائی نہیں کی۔ گھوڑوں کو میدان میں چرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ باغ میں ہی ایک طرف کھانا تیار ہونے لگا۔ رانی کے کسی بھی انداز سے ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ اسے کوئی جلدی ہو۔

اس باغ سے فوج نے تیسرے پہر تین بجے کوچ کیا۔

اور شام کو چھ بجے ایک چھوٹے سے جنگل میں پہنچ گئی۔

رانی نے فوج کو ٹھہرنے اور اس جنگل میں قیام کرنے کا حکم دیا۔

فوج کے تمام سپاہیوں کو حیرت ہوئی۔ جنگل سے ضرور کا فاصلہ صرف تین میل کا تھا اور فوج تقریباً تازہ دم تھی۔ گھوڑے بھی تھکے ہوئے نہیں تھے۔ کریرا سے وہ لوگ دس بجے کے بعد ہی روانہ ہوئے تھے۔ باغ تک بڑے آرام سے آئے تھے۔ باغ میں پھر دو گھنٹے کا آرام کیا تھا فوج نے۔ پھر اس باغ سے اس جنگل تک کا تین گھنٹے کا سفر بھی بڑے ہی آرام سے پورا ہوا تھا اور اب جب کہ ضرور صرف تین میل کے فاصلے پر رہ گیا تھا تو رانی نے قیام کا حکم دے دیا تھا۔

ابھی فوجی حیرت سے نکل بھی نہ پائے تھے کہ رانی نے اونچی آواز میں کہا ”ہم لوگ کل صبح دس بجے یہاں سے ضرور کے لئے روانہ ہوں گے۔“

ساری فوج مزید حیرت میں پڑ گئی۔

کچھ فوجیوں نے سمجھنے سمجھنے گلے محمد سے استفسار کیا۔

”مارانی ساب کا مرضی..... مارانی ساب کا حکم“ گل محمد نے کندھے جھٹک کر کہا۔ ”نہ ان کا مرضی میں دخل دیا جاسکتا ایسے، نہ ان کا حکم عدولی کیا جاسکتا ہے۔ او جو چاہے گا کرے گا اور ام سب سے کروائے گا۔ مالک ایسے“ فوجی خاموش ہو گئے۔

یہ اطلاع ایک گھنٹے کے اندر اندر ضرور کے قلعے میں مقیم سدا شوراؤ کو اس کے جاسوسوں نے پہنچا دی کہ رانی آگلی صبح دس بجے جنگل سے ضرور کیلئے روانہ ہوگی۔

سدا شوراؤ نے ضرور پہنچنے ہی اپنے دوست گوالیار کے حکمران سندھیا سے فوجی مدد حاصل کرنے کیلئے اپنے آدمیوں کو روانہ کر دیا تھا، اور اسے امید تھی کہ صبح تین چار بجے تک گوالیار سے مدد آجائے گی۔ اس لئے رانی کے آگلی صبح دس بجے جنگل سے ضرور کیلئے کوچ کرنے کی اطلاع پر ایک کردہ اطمینان سے سو گیا۔

رات میں دو بجے قیامت ٹوٹ پڑی۔

رانی کا حملہ اتنا شدید اور اتنا چابک تھا کہ یہاں بھی اس کے پہرے دار اور گنتی کے چند سپاہی کچھ نہ کر سکے۔ رانی کے فوجیوں نے انھیں چند منٹوں میں ہی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس بار رانی نے قلعے کا محاصرہ اس طرح کیا تھا کہ سدا شوراؤ اس چھوٹے سے قلعے سے فرار نہ ہو سکے..... اور وہ فرار نہیں ہو سکا۔

وہ آخری کمرے سے نکل کر قلعے کی چھت کی سیڑھیوں کی جانب بھاگا ہی تھا کہ اس پر گویا پہاڑ نے چھلانگ لگا دی۔

چھلانگ لگانے والا گل محمد تھا۔ وہ عتاب کی طرح سدا شوراؤ کو چھاپ بیٹھا۔ اسے ہلے تک کی مہلت نہیں دی گل محمد نے۔ پھر سندر مندر اور کاشی بانی نے اس غدار کو رسی سے جکڑ دیا۔

رانی کی تینوں سہیلیاں چاہتی تھیں کہ سدا شوراؤ کو قتل دیا جائے، لیکن گل محمد نے ان کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ اس نے رانی سے کہا ”مارانی ساب، امارا خیال

اے کہ غدار ملعون سدا شور او کو بانڈ کر چانسی لے جایا جائے تاکہ تمام غداروں کو علم او سکے، اور وہ اپنا آنکھ سے دیک سکے کہ مارانی ساب غداروں کے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ یاں سے چانسی تک اس مردود کو ایک گھوڑا سے باندھ کر پیدل لے جایا جائے تاکہ اس کو غدار کی کا مناسب سزا مل سکے اور دوسروں کو عبرت..... چانسی لے جا کر اس ملعون کو پانسی دیا جائے۔“

رانی نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔ مردہ سدا شور او کے بجائے زندہ سدا شور او کو قیدی بنا کر کھلے عام اور سرعام جھانسی لے جانا زیادہ سودمند تھا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔

وہ سدا شور او کو قیدی بنا کر جھانسی لائی اور قلعے میں قید کر دیا، اس طرح پہلی بغات کو رانی نے بڑی بے دردی سے پکڑ دیا۔ اس کی دھاک اور جم گئی۔ جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر پھیل گئی کہ رانی نے اپنا ایک بھی فوجی کھوئے بغیر سدا شور او کی فوج کو نیست و نابود کر دیا تھا اور غدار سدا شور او کو اس کے اپنے ٹھکانے، اس کی اپنی پناہ گاہ سے گرفتار کر کے جھانسی لے آئی تھی۔

## دسواں باب

1857 کے وہ بڑے مصروفیت بھرے دن تھے۔ رانی کا دن صبح چار بجے شروع ہوتا تھا اور رات کے گیارہ بجے ختم ہوتا تھا۔ تمام جھانسی مصروف تھی، مشغول تھی۔ سارا شہر ایک ایسی مشغول دنیا میں تبدیل ہو کر رہ گیا تھا جہاں ہر شخص کچھ کر گزرنے کو بے تاب نظر آنے لگا تھا۔ کسی نے کسی سے یہ نہیں کہا تھا کہ انگریزوں سے جنگ ہوئی ہے، لیکن نہ جانے کیسے بچہ جان گیا تھا کہ بہت جلدی وہ دن آنے والا ہے۔ جب انھیں گوروں کے خلاف ہتھیار اٹھانے ہیں اور انھیں اپنے ملک سے نکال باہر کرتا ہے۔ ہر شخص کو یہ اندازہ بھی تھا کہ جنگ آسان نہیں ہوگی۔ فرنگی کو شکست دینا بہت مشکل ہوگا، بڑی محنت کرنی ہوگی بہت خون بہانا پڑے گا، نہ جانے کتنی اور کس کس چیز کی قربانی دینی پڑے گی..... لیکن کہیں کوئی گھبراہٹ، کوئی خوف، کوئی ہراس نہیں تھا..... ایک جوش تھا کہ تمام اٹھلاتا پھرتا تھا، ایک عزم تھا جو ہمہ وقت آپے سے باہر ہوا جاتا تھا..... ایک انتظار..... ہر طرف ایک انتظار تھا..... کچھ شروع ہونے کا انتظار..... توپوں کی گرج کا انتظار..... تلواروں کی ٹھنک کا انتظار..... ہر سمت پر حوصلہ آوازوں کا ارتعاش فضا میں چکراتا پھر رہا تھا۔ مٹی سڑکی کچھ کر گزرنے کی آرزو غنی شونی، غنی توانائی، غنے عزم کے ساتھ جیسے جھانسی کے نیلے آکاش میں اتراتی، اڑتی پھر رہی تھی۔ پرانی تلواروں سے زنگ چمڑایا جا رہا تھا۔ انھیں چمکایا جا رہا تھا، ان پر سننے سے دھار کھی جا رہی تھی۔ غنی تلواریں ڈھالی جا رہی تھیں۔ لوہے کی ایک ایک کیل، ایک ایک کلوا لوہاروں کے پاس

پہنچا دیا گیا تھا۔ لوہاروں کی بھٹیوں پر وقت گرم رہتیں، دھونکیاں ہر وقت چلتی رہتیں۔ نہائیاں ہر وقت تیار رہتیں، ہتھوڑے اور گھن ہر وقت مصروف رہتے۔ انھیں مصروف رکھنے والے بازو بلند ہوتے رہتے اور پوری قوت سے پیچھے آتے رہتے، پنڈگاریاں اچھلتی رہتیں، لوہے کے ٹکرے نہائی پر ہتھیاروں کی شکل اختیار کرتے رہتے..... کوئی کسی کو تعلیم نہیں کر رہا تھا کوئی کسی کو کچھ بتا نہیں رہا تھا، کوئی کسی کو حکم نہیں دے رہا تھا۔ ہر شخص..... ہر فرد کو علم تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ گولہ بارود بنانے کا کارخانہ دن رات کام کر رہا تھا۔ جہانسی کے سارے اکھاڑے پھر سے آباد ہو گئے تھے اور روشنی کے اس سرے سے اس سرے تک مصروف رہنے لگے تھے۔ پچاسوں نئے اکھاڑے بھی بن گئے تھے اور ہمہ وقت زور آزمائی میں مشغول رہنے لگے تھے۔

عورتیں مردوں کے شانہ بہ شانہ مصروف عمل تھیں۔ وہ مردوں سے زیادہ مصروف تھیں..... گھر بھی سنبھال رہی تھیں، اور گھر کے تمام کاموں سے فارغ ہو کر اس جنگ میں عملی حصہ لینے کی تیاریاں بھی کر رہی تھیں۔ جو انھیں جہانسی کے دروازے پر کھڑی نظر آ رہی تھی۔

گرمی کا موسم درواہ تاخیر سے ختم ہوا..... اور اس طرح برسات کا موسم درواہ تاخیر سے شروع ہوا۔ لیکن جب بارش ہوئی تو بادل ٹوٹ کے برسے..... اور برستے ہی چلے گئے۔ مگر لگاتار موسلا دھار بارش بھی جہانسی کے جوش کو خنڈانہ کر سکی، مصروفیت میں کوئی اڑچن نہ ڈال سکی۔ اکھاڑے برستے بادلوں کے پیچھے سے ہٹ کر چھتوں کے نیچے منتقل ہو گئے۔ روٹی اور پیال کے موٹے موٹے گدوں پر زور بھی ہونے لگا، کسرت بھی اور کشٹیاں بھی۔

گھوڑ سواری اور شمشیر زنی کی تربیت برستے پانی میں بھی ہوتی رہی۔ ان ہی پھینکے ہوئے مصروف دنوں میں رانی کو اطلاع ملی کہ ڈاکو ساگر سنگھ نے برو آساگر کے آس پاس تار تار توڑ کئی ڈاکے ڈالے ہیں۔ یہ خبر تشویش ناک تو تھی ہی، رانی کو

ناگوار بہت گزری۔ وہ تیاری کی اس گھڑی میں پورے جہانسی میں مکمل امن چاہتی تھی، تاکہ تمام باشندے پوری یکسوئی کے ساتھ خود کو اس جدوجہد کے لئے جسمانی و ذہنی طور پر تیار کر سکیں جو ناگزیر تھی۔ اسے اندازہ ہی نہیں مکمل یقین تھا کہ انگریزوں کو صرف وقت درکار ہے۔ جیسے ہی وہ دلی، کانپور، روہیل کھنڈ اور اودھ کی بنیادیں دبائے اور کپٹے میں کامیاب ہو جائیں گے، انگریزی فوجیں جہانسی پر چڑھ آئیں گی۔ اس لئے وہ جہانسی میں کوئی اندرونی خلفشار نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ ساگر سنگھ کے ڈاکوں کی خبر اسے بہت زیادہ اکھری۔ اس نے فوراً انور خدا بخش کو طلب کیا اور کہا۔ ”کنور صاحب..... میں پندرہ دن کے اندر اندر ڈاکو ساگر سنگھ کو اپنے سامنے زندہ یا مردہ دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”دیکھ لیں گی مہارانی صاحبہ“ کنور بخش نے بڑے ادب سے یقین دیا۔  
”کوشش یہ کیجئے کہ ساگر سنگھ زندہ ہی گرفتار ہو سکے۔“ رانی کچھ سوچتے ہوئی بولی۔

”جو حکم مہارانی صاحبہ“  
”بس جائیے..... میرے خیال میں کل ہی نکل جائیے۔“ رانی نے کہا۔  
”کل کیوں مہارانی صاحبہ؟“ خدا بخش نے کہا، ”اگر حکم ہو تو یہ خادم آج ہی نکل جاتا ہے۔“  
”ٹھیک ہے“ رانی نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔ ”جتنی جلد ممکن ہو سکے یہ کام کر ڈالیے۔“

خدا بخش سلام کر کے چلا گیا..... اور دو گھنٹے کے بعد اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ برو آساگر کیلئے روانہ ہو گیا۔

شام کو وہ برو آساگر پہنچ گیا۔ اول سیدھا ہاتھانے جا کر بڑے دروغہ سے ملاقات کی۔ دیر تک وہ ساگر سنگھ کے بارے میں دروغہ سے سوال کر تا رہا اور معلومات حاصل کر تا رہا۔

ساگر سنگھ کا گھر برو آساگر سے چھ کوس کے فاصلے پر راولی نام کے اس گاؤں میں تھا۔ برو آساگر کا تھا نیدار رتن سنگھ سنی بار ساگر سنگھ کے گھر پر دبش مار چکا تھا، لیکن اسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی..... ساگر سنگھ چھلا وہ تھا۔ تمام حالات سن کر خدا بخش کو یقین ہو گیا کہ ساگر سنگھ کو مقامی لوگوں کی مدد بھی حاصل ہے اور تعاون بھی..... ”میرے خیال میں ہر بار جب پولس اس کے گھر پر دبش مارتی ہے تو اسے پہلے سے علم ہو جاتا ہے۔“ خدا بخش نے سوچا پھر اس خیال نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ہونہ ہو تھا نے کا بھی کوئی سپاہی ساگر سنگھ کا خبر یا جاسوس ہے جو ہر حملہ کے پلان سے اسے پہلے ہی آگاہ کر دیتا ہے اور ساگر سنگھ وقت سے پہلے ہی فرار ہو جاتا ہے۔

اس نے تھانے کے تمام بارہ سپاہیوں کو طلب کیا اور بولا۔

”مہارانی صاحبہ کو اطلاع ملی ہے کہ ساگر سنگھ گھوما گاؤں میں کل ڈاکہ ڈالنے والا ہے۔ اس لئے مہارانی صاحبہ نے مجھے بھیجا ہے۔ صبح سے ہی ہم سب لوگ گھوما گاؤں کے چاروں طرف بچیل جائیں گے۔ اور درختوں پر چڑھ کر بیٹھ جائیں گے۔ ساگر سنگھ چاہے جس طرف سے گاؤں میں داخل ہوا، اسے اور اس کے تمام ساتھیوں کو ہر حال میں گولی مار دیں ہے، ایک بھی ڈاکو زندہ نہ بیچے۔ یہاں تھانے پر صرف دروغہ کرن سنگھ ایک سپاہی کے ساتھ رہیں گے۔ بڑے دروغہ رتن سنگھ میرے ساتھ ہوں گے اور ہم لوگ گاؤں کے باہر برو آساگر والے راستے اور گھوسی والے راستے پر گشت کریں گے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ساگر سنگھ ان ہی دور استوں میں سے کسی سے آئے گا۔ اگر وہ ان دونوں میں سے کسی راستے سے آیا تو ہم لوگ اسے مار لیں گے اور اگر وہ کسی دوسرے راستے یا کھیتوں سے ہو کر آتا ہے تو تم لوگ اسے مار لینا۔ بہر حال ساگر سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو کل زندہ نہیں بچنا چاہئے۔“

منصوبے کے مطابق اگلے دن جھوٹے دروغہ اور ایک سپاہی تھانے پر رہ گئے۔ گیارہ سپاہیوں کو گھوما گاؤں کے باہر چاروں طرف آم کے گھنے درختوں پر چڑھا

دیا گیا جہاں گھنی شاخوں کے درمیان بیٹھ کر وہ ساگر سنگھ اور اس کے ساتھیوں کا انتظار کرنے لگے۔

خدا بخش اپنے ساتھیوں اور دروغہ رتن سنگھ کے ساتھ موسلا دھار برستے پانی میں راولی کی طرف چل دیے۔

تین گھنٹے میں وہ اور اس ساتھی راولی پہنچ گئے۔ بجلی کی سی تیزی سے خدا بخش نے ساگر سنگھ کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔

ساگر سنگھ کا مکان اونچائی پر تھا۔ دو پہر کا کھانا کھا کر ساگر سنگھ آرام کر رہا تھا۔ اسے جیسے ہی محاصرے کی اطلاع ملی وہ مکان کی چھت پر چڑھ گیا اور جھروکے سے نیچے دیکھنے لگا۔

فوجی مکان کی دیوار پر چڑھ رہے تھے۔

ساگر سنگھ نے بندوق اٹھائی، ایک فوجی کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ وہ فوجی تو زخمی ہو کر گر گیا لیکن اس سے پہلے کہ ساگر سنگھ دوسرا فائر کرتا، کئی فوجی اس کے مکان کے آگہن میں کود آئے۔ ان میں خود کور خدا بخش بھی تھا۔

ساگر سنگھ نے دوسرا فائر کیا۔ اور گولی کور خدا بخش کے بازو کا گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی۔ خوش قسمتی سے زخم مہلک نہیں تھا۔

خدا بخش کے ساتھی فوجی اور دروغہ رتن سنگھ برابر فائر کر رہے تھے اور ساگر سنگھ تنہا تھا۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اگر وہاں ٹھہر رہا تو کسی بھی دم یا تو گرفتار ہو جائے گا یا کسی فوجی کی بندوق کی گولی اسے چاٹ جائے گی۔ فوجیوں کے پاس ایسی بندوقیں تھیں جن میں کار توں بھرے جاتے تھے جب کہ ساگر سنگھ کے پاس اس وقت جو بندوق تھی اس میں نال کے منہ سے بارود اور گولیاں ہاتھ سے بھرنی پڑتی تھیں اور ایک بار بندوق بھرنے میں کم از کم ڈیڑھ منٹ کا وقت لگتا تھا۔ اس لئے اس نے فرار ہونے میں ہی عافیت دیکھی۔ یہ اس کا اپنا مکان تھا۔ اس کی پناہ گاہ تھی۔ اس نے اپنے فرار کا راستہ نہ جانے کب سے ایسے ہی نازک وقت کیلئے تیار کر رکھا تھا۔

فوجیوں کو چمکے دے کر وہ فرار ہو گیا۔

بہر حال خدا بخش کو ناکامی ہی ملی۔ اسے بے حد شرمندگی تھی۔ اس نے پلان تو ایسا بنایا تھا کہ ساگر سنگھ کو اطلاع نہ ملے، اور اس کا پلان کارگر ثابت بھی ہوا تھا۔ ساگر سنگھ کو اطلاع نہیں مل سکی تھی کہ اس کے مکان پر دہش ماری جارہی ہے۔ تھانے کے سپاہی تو گھوما کے باہر آم کے درختوں پر چڑھے ساگر سنگھ کا انتظار کر رہے تھے۔ کسی کو بھی یہ علم نہیں تھا کہ انھیں محض دکھاوے کیلئے درختوں پر چڑھایا گیا ہے اور اصلیت میں کنور خدا بخش راوی میں ساگر سنگھ کے مکان پر دہش مارنے جارہے ہیں۔ لیکن اس کا میاب پلان کے باوجود ایک فوجی اور خود خدا بخش کو زخمی کر کے ساگر سنگھ فرار ہو گیا تھا۔

خدا بخش اپنے ساتھیوں کے ساتھ برو آساگر واپس آگیا، ایک تو اس نے راوی میں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا، دوسرے یہ کہ اس کے اور زخمی فوجی کے زخموں کا مناسب اور فوری علاج بھی برو آساگر میں ہی ممکن تھا۔ خدا بخش کے زخمی ہونے کی اطلاع رانی کو دوسرے دن ملی۔ ایک منٹ ضایع کئے بغیر وہ سندھ، مندر، دیوان رگھو ناتھ سنگھ، کنور گل محمد اور دس پشیمان اور بندیلے فوجیوں کے ساتھ مردانہ کپڑوں میں اور لوہے کی ٹوپی لگا کر بڑی خاموشی سے برو آساگر کے لئے روانہ ہو گئی۔

گل محمد نے کہا بھی تھا کہ ”مادانی ساب اگر آپ حکم دے تو آپ کا یہ تابعدار جاکر ساگر سنگھ کو گرفتار کر لائے۔“ لیکن رانی نے اس کی بات سے اتفاق نہیں کیا۔ ”نہیں کنور گل محمد.....“ اس نے کہا تھا ”خدا بخش گھائل ہو چکے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس سنے میرا جانا جڑو رہی ہے، تم میرے ساتھ چلو۔“

اور اس طرح یہ لوگ اپنے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر برو آساگر کی جانب چل دئے۔ حسب معمول گل محمد کا گھوڑا رانی کے گھوڑے کے برابر لیکن ایک قدم پیچھے چل رہا تھا۔ رانی کے ایک دم پیچھے صمد خان کا گھوڑا تھا۔ رانی کے تحفظ کے لئے وہ جو بھی احتیاط وضع کرتا چاہتا تھا بڑی خاموشی سے کر لیتا تھا اور اس سلسلے میں کسی کی

بھی کو تاہی اس کیلئے ناقابل برداشت تھی۔ وہ سینئر جرنلوں کے مشورہ سن لیتا تھا ان پر آگھ بند کر کے عمل نہیں کرتا تھا وہ کہتا تھا ”مادانی ساب امید کا آخری شمع ایسے..... اگر خدا خواستہ یہ شمع گل ہو گیا تو بڑا گھر اندھیرا، بڑی پائدار تاریکی سارا ملک میں پھیل جائے گا اس لئے مادانی ساب کا سلامتی صرف جانی کا واسطے ہی نہیں، تمام ملک کا واسطے ضروری ایسے..... ام مادانی ساب کا تحفظ کا معاملہ میں کو تاہی نہیں برت سکتا..... ایک دن اللہ مصنف اکبر کے حضور ام کو پیش اوتا ہے۔“

جواہر سنگھ نے گل محمد کے یہ الفاظ سن و عن رانی کے سامنے دوہرائے تھے اور رانی نے وہ فور جذبہ سے مغلوب ہو کر اپنے ہونٹ کس کے بھیج لائے تھے، آنکھیں کس کے پیچ لیں تھی۔ اس نے دل ہی دل میں گل محمد کی سلامتی کیلئے اپنے بھگوان سے پراہر تھنکی تھی اور دل کی تمام گہرائیوں سے اس کا شکر ادا کیا تھا کہ اس نے بھارت میں ایسے دیل بھکت اور ایسے سوامی بھکت پیدا کئے تھے۔

رانی نڈر اور حوصلہ مند تو ہمیشہ سے تھی، لیکن جب سے گل محمد اس کے قریب آیا تھا وہ اپنے تحفظ کی طرف سے قطعی بے فکر ہو گئی تھی اور اس کا حوصلہ اور بڑھ گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس پر آنے والی آنچ کو گل محمد اپنے جسم پر اسی طرح جھیل لے گا، جس طرح ایک بیٹا اپنی ماں کے جسم پر آنے والی آنچ کو اپنے جسم پر جھیل لیتا ہے۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ گل محمد اس کے قریب رہنے کے معاملے میں سخت ہی نہیں بلکہ ضدی واقع ہوا تھا..... اور وہ روکتی بھی نہیں تھی گل محمد کو اپنے قریب رہنے سے..... وہ جانتی تھی کہ اس معاملے میں وہ اس کی بات بھی نہیں مانے گا۔ اس فخر تھا اپنے جاں نثار ساتھی پر۔ اسے ناز تھا اپنی قسمت پر۔

قافلہ چڑھی ہوئی بیڑا کے کنارے ٹھہر گیا۔ ایسا گل رہا تھا کہ سردیوں اور گرمیوں میں سبک رفتہ سے پہننے والی بیڑا میں دم بہ دم پانی بڑھتا جا رہا ہے اور ہر لحظہ اس کے جوش اور اس کے غریب میں اضافہ ہو تا جا رہا ہے۔

رانی نے ایک لمحہ خاموشی کے ساتھ غضب ناک بیڑا کو دیکھا پھر بڑی

خاموشی اور بے پرواہی سے اپنا گھوڑا چڑھے ہوئے دریا میں اتار دیا۔ گل محمد رانی کے ساتھ داہنی طرف ہنوز لگا ہوا تھا، اس کی نگاہیں بیڑا کے پر شور و پر زور پانی پر نہیں تھیں بلکہ رانی پر مرکوز تھیں۔ کوئی گھبراہٹ، کوئی پریشانی، زرا سی بھی فکر مندی گل محمد کو رانی کے چہرے پر نظر نہیں آئی اور وہ سوچنے لگا کہ رب کا نکتہ نے فلوڈ کا جگر عطا کر کے ماری سب کوزمین پر بھیجا ہے۔ اس کی ماری سب جرأت کا پیکر تھی، جسم شجاعت تھی۔

بیس منٹ بعد قافلہ ندی کی دوسرے طرف تھا۔ گھوڑے بری طرح تھک گئے تھے اور ہانپ رہے تھے۔ رانی نے انھیں تین گھنٹوں کا آرام دیا۔ اس درمیان اس کے ساتھیوں نے بھی اپنے کپڑے سکھائے۔ تازہ دم ہو کر قافلہ برو آساگر کیلئے پھر روانہ ہو گیا۔

ایک بجے کے قریب وہ لوگ برو آساگر پہنچ گئے۔

رانی نے سب کا حال پوچھا، فوجی کے سر پہ ہاتھ پھیرا، خدا بخش کے سر پہ ہاتھ پھیرا، ان دونوں کی مرہم پٹی اور علاج کا جائزہ لیا پھر خدا بخش سے دبش کا حال پوچھنے لگی۔

ایک گھنٹے کے بعد برو آساگر کا تھانہ دار رتن سنگھ آگیا۔ رانی نے اس کے ساتھ مشورہ کیا اور برو آساگر، راولی گاؤں اور کھسئی کے جنگل کے راستوں اور گرد و نواح کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کیں۔ اس بیٹھک میں رانی نے دیوان رگھو ناتھ سنگھ، کنور خدا بخش، کنور گل محمد، تھانہ دار رتن سنگھ اور اپنی سہیلیوں مندر اور موتی بانی کو بھی شریک کیا۔

”راولی گاؤں کے لوگوں کا دیوبار (رویہ) کیا ہے؟“ اس نے رتن سنگھ پوچھا۔ ”مہارانی جی..... گاؤں کے لوگ ساگر سنگھ سے ڈرتے بھی ہیں مگر اس سے پرہم بھی کرتے ہیں۔ ایک طرح سے کہا جاسکتا ہے کہ راولی کے لوگ اس کے ساتھ ہیں۔ اس لئے کوئی بھی اس کے بارے میں کچھ بھی بتانے کو تیار نہیں ہو تا ہر ایک کا

ہر سوال کے جواب میں ایک ہی جملہ ہوتا ہے ”جی ہمیں نہیں پتہ“ ہمارے سپاہی جب بھی راولی جاتے ہیں ساگر سنگھ کی ٹوہ لینے کے لئے تو گاؤں کا ہی کوئی نہ کوئی آدمی ساگر سنگھ کو خبر کر دیتا ہے اور وہ غائب ہو جاتا ہے۔ گاؤں میں کسی بھی باہر والے کی آمد اور موجودگی کی اطلاع ساگر سنگھ کو فوراً ہو جاتی ہے۔ کنور خدا بخش جی نے بڑی ذہانت کے ساتھ اسے پکڑنے کا منصوبہ بنایا تھا اس لئے ساگر سنگھ کو ان کے حملے کی ہینک بھی نہیں پڑی۔ لیکن بد قسمتی سے کنور جی گھائل ہو گئے اور ساگر سنگھ فرار ہو گیا۔ رتن سنگھ نے بڑی تفصیل سے بتایا۔

خدا بخش کی طرح رانی کو بھی شک تھا کہ تھانے کا کوئی سپاہی بھی ساگر سنگھ کا مخبر ہے۔ لیکن اس نے اپنے اس شک کا اظہار نہیں کیا۔ ”اپنے گاؤں راولی کے علاوہ ساگر سنگھ کے ٹھکانے اور کہاں کہاں ہیں۔“ رانی نے دریافت کیا۔

”کھسئی کے جنگل میں“ دروغہ رتن سنگھ نے بتایا۔

”یہاں سے کتنی دور ہے کھسئی کا جنگل؟“ رانی نے پوچھا۔

”بارہ میل مہارانی جی“ رتن سنگھ نے جواب دیا۔

”مطلب یہ کہ اگر چھینے کے لئے ساگر سنگھ راولی میں اپنے گھر سے بھاگے گا تو سیدھا کھسئی کے جنگل میں جائے گا۔“ رانی نے کہا۔

”جی مہارانی جی“ رتن سنگھ نے کہا۔

”ہوں“ کہہ کر رانی نے اپنے ساتحوں کے چہروں پر ایک نظر ڈالی۔ گل محمد کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اسے احساس ہو گیا کہ گل محمد کچھ کہنا چاہتا ہے۔ رانی نے ابروؤں کی ایک ہلکی سی جنبش سے دریافت کیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ گل محمد نے رانی کا سوال سمجھ لیا اور خاموشی سے دروغہ رتن سنگھ کو دیکھنے لگا۔ رانی سمجھ گئی کہ گل محمد دروغہ کی موجودگی میں کچھ کہنا نہیں چاہتا چنانچہ اس نے دروغہ سے کہا ”ٹھیک ہے رتن سنگھ۔ تم ابھی باہری ٹھہرو۔ میں تمھیں پھر بلاؤں گی۔“

”جو آگیا مہارانی جی“ کہہ کر رتن سنگھ کھڑا ہو گیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر اور سر

کو گھنٹوں تک جھکا کر اس نے رانی کو پر تام کیا اور باہر چلا گیا۔ اس کے باہر جانے کے بعد رانی نے گل محمد سے کہا ”کنور گل محمد..... مجھے لگا بیٹھے تم کچھ کہنا چاہتے ہو۔“

جی مہارانی سب ”گل محمد نے بڑے ادب سے اثبات میں سر ہلایا۔“ ام یہ عرض کرتا جاتا کہ یہ دروغہ رتن سنگھ ام کو اچا آدمی لگتا..... مگر ضرورت سے زیادہ سید ہے۔ اس کا کوئی سپائی..... ساگر سنگھ کا آدمی لگتا..... اس کا جبر اس کا جاسوس۔ جی دروغہ جب جب دیش مارتا، ساگر سنگھ کو پہلے سے خبر اوجاتا اور فرار اوجاتا۔“

”میرا خیال ہے کہ کنور گل محمد ٹھیک کہہ رہے ہیں“ مہارانی جی ”دیوان رگھو ناتھ سنگھ نے کہا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا کارن ہے کہ ساگر سنگھ ایک تک گرفتار نہیں ہو سکا۔ انگریزوں نے اسے ایک رات گرفتار کر لیا تھا، مگر ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ انگریزوں نے برو آساگر تھانے سے کوئی مدد نہیں لی تھی۔ یہاں کسی کو علم ہی نہیں تھا کہ انگریز خودہ ساگر سنگھ کی گرفتاری کے لئے آ رہے ہیں۔ انگریزوں نے چپ چاپ اچانک ہی اسے گھیر لیا تھا اور گرفتار کر لیا تھا۔“

”بالکل صحیح دیوان سب“ گل محمد نے تائید کی۔ ”اور امارا کنور خدا بخش نے بی اچانک ای دیش مارتا۔ اس کا خبر پہلے سے کسی کو نہیں تا۔ سارا سپائی گوماگاؤں کے ارد گرد باہر تا۔ اگر کنور سب ایسا نہ کرتا اور دیش کربات کر دیتا تو ساگر سنگھ پہلے ہی فرار اوجاتا۔“

”میرے کھیاں میں مہارانی جی کنور گل محمد کھان یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ساگر سنگھ کو گربھتا کرنے کی جو بھی یو جتا بنائی جائے اسے گیت ر کھا جائے اور ساگر سنگھ کو اچانک ہی گھیر اجائے۔“ مندر نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

رانی استفہامیہ نظروں سے گل محمد کی طرف دیکھا۔

”جی مہارانی سب“ گل محمد نے کہا ”مندر بین (بین) صحیح اندازہ لگایا۔ امارا منصوبے کا علم صرف مہارانی سب کے خاص لوگوں کو اوجاتا ہے۔“

”میں خود بھی اپنی یو جتا کو گیت ہی رکھنا چاہتی ہوں۔ اب آپ سب کی صلاح بھی یہی ہے تو ایسا ہی ہوگا۔“ رانی کے کیا۔

اور پھر ساگر سنگھ کی گرفتاری کا منصوبہ تیار ہونے لگا۔

ایک گھنٹے کے بعد موتی بانی ایک بوڑھی عورت کا بھیس بنا کر خاموشی سے قلعے کے عقبی بچانک سے نکل کر راولی گاؤں کی طرف چل دی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک باغ میں پہنچی جہاں گل محمد گھوڑا لے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ بغیر کچھ کہے گھوڑا اس نے موتی بانی کے حوالے کر دیا۔ موتی رکاب میں پیر دال کر گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گئی اور گھوڑے کو راولی جانے والی پگڈنڈی پر ڈال دیا۔ گل محمد اپنا گھوڑا لے باغ میں انتظار رکرتا رہا۔ پھر پندرہ منٹ کے بعد وہ بھی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر راولی کی طرف روانہ ہو گیا۔

موتی بانی کے تحفظ کیلئے رانی نے گل محمد کو اس کے پیچھے روانہ کیا تھا۔ رات کو موتی بانی خبر لائی کہ ساگر سنگھ گھسائی کے جنگل سے اپنے گھر راولی واپس آ گیا ہے۔

رات کو دو بجے دیوان رگھو ناتھ سنگھ اپنے ساتھوں کے ساتھ دروغہ رتن سنگھ اور اس کے پانچ سپاہیوں کی رہنمائی میں راولی گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں تیز بارش ہونے لگی اور ان لوگوں کو ایک گھنٹے تک ایک باغ میں ٹھہرنا پڑا۔

صبح پانچ بجے رگھو ناتھ سنگھ نے راولی میں ساگر سنگھ کے مکان کو گھیر لیا۔ ہلکی بوند ابارندی ہو رہی تھی اور آسمان گہرے سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

کوئی زور زبردستی نہیں کرنی پڑی۔ ساگر سنگھ کے ماسوں زلابھائی اوم پال نے گھر کا دروازہ کھول دیا۔ رگھو ناتھ سنگھ پر نظر پڑتے ہی اس نے ہاتھ جوڑ کر بڑے ادب سے رگھو ناتھ سنگھ کو پر تام کیا اور بولا۔ ”حکم مالک؟“

”ساگر سنگھ کہاں ہے؟“ رگھو ناتھ سنگھ نے اے گھورتے ہوئے سوال کیا اور خونخوار لہجے میں بولا۔ ”جھوٹ نہیں سنو گا۔“

”میں سرکار کے آگے جھوٹ بولے کا سانس بھی نہیں کر سکتا، جو دیوان



جی۔ آپ کو پچھتا ہوں ”اوم پال نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔“ مہارatham اوم پال سنگھ  
ہے جوڑ میں ساگر سنگھ کا میرا بھائی ہوں۔“

”میں نے پوچھا تھا ساگر سنگھ کہاں ہے؟“ رگھوناتھ سنگھ غرایا۔

”ابھی ایک گھنٹہ پہلے ساگر سنگھ کو خبر ملی کہ آپ اسے گریختار کرنے آتے  
ہیں۔ وہ بھاگ گیا۔ اوم پال نے بتایا۔

”خبر کون لایا تھا؟“ رگھوناتھ سنگھ کا لہجہ خونخوار ہی رہا۔

”یہ تو مالک میں نہیں دیکھا“ اوم پال نے کہا۔

”کہاں گیا ہے ساگر سنگھ؟“ رگھوناتھ نے سوال کیا۔

”مجھ سے کہہ گیا ہے کہ وہ اللت پور کی دسامیں جا رہا ہے۔ کچھ دن اب اللت

پور ہی رہے گا۔“ اوم پال نے بتایا پھر ادھر ادھر دیکھ کر دیر سے سے بولا۔ ”اسے پتہ

لاگ گیا ہے سرکار کہ مہارانی جی کھداس کی گریختاری کے لئے پدھاری ہیں۔“

رگھوناتھ سنگھ نے مکان کی تلاشی لی۔ نہ تو ساگر سنگھ ملا، نہ اس کا کوئی ساتھی۔

تلاشی کے بعد اس نے رتن سنگھ سے کہا۔ ”چلو۔ ہم بھی اللت پور کی طرف ہی چلتے

ہیں۔ رستے میں ہی کہیں اس پر ہاتھ ڈال دیں گے۔“

## گیارہواں باب

ساگر سنگھ صبح ساڑھے چار بجے کے قریب اپنے دس ساتھیوں کے ساتھ  
بڑی غلت میں برستے پانی میں راوی سے رخصت ہوا تھا۔ اس کے خبر نے اسے اطلاع  
دی تھی کہ خود رانی لکشی بائی برد آساگر میں ڈیرہ بنائے ہوئے ہیں اور انھیں اطلاع  
مل گئی ہے کہ ساگر سنگھ راوی میں اپنے گھر پر موجود ہے۔ کسی بھی سنے رانی جی اسے  
گھیر سکتی ہیں، اس لئے ایک بھی لمحہ ضائع کئے بغیر وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ نکل  
کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنے ماسوں زاد بھائی اوم پال کو گھر پہ چھوڑ دیا تھا اور چلتے چلتے اس  
سے کہہ گیا تھا کہ وہ اللت پور کی طرف جائے گا۔

مگر گاؤں سے نکلے ہی اس نے اللت پور جانے والا راستہ نہ لے کر کھسنی جانے  
والا راستہ ہی لیا، اور بڑے آرام سے ڈیڑھ گھنٹے بعد کھسنی جنگل پہنچ گیا۔ صبح کا اجالا  
پھیل گیا تھا، مگر کوہ بوند اباندی ابھی بھی ہو رہی تھی۔

ساگر سنگھ ابھی جنگل میں داخل ہوا ہی تھا کہ اس پر اور اس کے ساتھیوں پر  
قیامت ٹوٹ پڑی۔ ادھر ادھر کے درختوں پر سے ان لوگوں پر رانی کے بندیلے اور  
پٹھان فوجیوں نے چھلانگیں لگائی تھیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھ سکتا فوجی  
انھیں چھاپ بیٹھے۔ وہ سب اپنے اپنے گھوڑوں سے گرے۔ تبھی اور فوجی بھی  
درختوں کے پیچھے سے نکل آئے۔ انھوں نے سارے ڈاکوؤں کو دبوچ لیا۔

ساگر سنگھ بہت عجزاً اندر دست دیو قامت شخص تھا۔ اس نے پوری کوشش کی  
کہ وہ اس شخص کی گرفت سے نکل سکے جس نے اس پر چھلانگ لگائی تھی۔ لیکن یہ

مکن نہ ہو سکا۔ پھر اس نے پوری کوشش کی کہ اس کا ہاتھ اپنی کمر میں لگے بہتول تک پہنچ سکے۔ مگر اسکی ایک نہ چلی..... گل محمد نے اسے جہش تک نہ کرنے دی۔

”شابش کنور گل محمد“ رانی ایک گھٹی جھاڑی کے پیچھے سے نکل کر سامنے آگئی وہ اپنے گھوڑے پر سوار تھی۔ سبھی ڈاکوؤں کو رسیوں سے جکڑ لیا گیا۔

رانی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ سب کو لے کر برو آساگر آگئی۔ دو گھنٹے بعد ساگر سنگھ رسیوں سے جکڑا ہوا رانی کے سامنے کھڑا تھا۔

رانی کچھ دیر اسے خونخوار نظروں سے گھورتی رہی پھر بڑے سرد لہجے میں بولی ”یہ اس دیش کا دور بھاگیہ (بد قسمتی) ہے کہ اب یہاں کشتی را بوجت ڈاکر ڈالنے لگے ہیں..... وہ جنھوں نے اسروں کا دانوؤں کا دودھ کیا تھا، جنھوں نے لوگوں کو برے لوگوں کے ظلم سے بچایا تھا، جو ہمیشہ برائی سے لڑے تھے، جنھوں نے ہمیشہ دوسروں کے جان مال کی رکشا کی تھی آج ان کے دنش کے لوگ ڈاکے ڈال رہے ہیں..... کھد اسر اور دانو بن گئے ہیں، کھد ظلم کرنے لگے ہیں، کھد ہر طرح کی برائیوں میں پڑ گئے ہیں، جان کے شتر اور مال کے لیرے ہو گئے ہیں..... تمھیں اور تمھارے ساتھیوں کو ایسی بھیانک سزا دوں گی کہ دیکھنے والے تو دیکھنے والے سننے والے تھراؤ نہیں گے۔“

”مہارانی جی جو چاہیں کریں۔ مالک ہیں۔ پر کیا اس غما کر کی بات بھی سنیں گی۔؟“ ساگر سنگھ نے کہا۔

”کہو“ رانی بڑے خشک لہجے میں بولی۔

”مہارانی جی“ ساگر سنگھ کی آواز میں دکھ تھا۔ ”میرا کھاندان ہمیشہ سے راجا ناگپال کی فوج میں رہا ہے۔ ہم لوگ واکان جی جان مال کی رکشا ہی کرتے تھے۔ پر پھر ہوا یہ کہ راجا ناگپال نے انگریجوں سے دوستی کر لی اور انگریجوں کے کہنے سے..... میں تو کہوں گا کہ انگریجوں کے حکم سے تمام غما کروں کو ایک ایک کر کے اپنی نوکری سے نکال دیا۔ ہمارے پاس جو تھوڑی بہت جھنڈیں تھیں وہ سب انگریجوں نے ہم سے چھین لیں اور اپنے چالو سوں کو دے دیں۔ کسی کی کوئی پھر یاد نہیں سنی گئی..... اور پھر یاد کوئی

کر تا بھی کس سے؟ کوئی نیم، کوئی کانون رہ ہی کہاں گیا تھا۔ کھڑی پھسلوں میں انگریج صاحب لوگ شکار کے لئے گھوڑے دوڑا دیتے تھے۔ راجا ناگپال ہی نہیں ہر طرف سارے ہی جاگیر دار اور جب سے جاگیریں ختم کی گئی ہیں تب سے سارے جمیدار سب انگریجوں کے پنجو ہو کر رہ گئے ہیں، کھد کھڑی پھسلوں میں اپنے انگریج اکاؤں کو شکار کھلاتے ہیں۔ ہم اپنی ہی جھنڈوں کے لئے پرانے ہو گئے۔ پھر بھوکوں مرنے کی نوبت آگئی..... اور ہم لوگ مجبور ہو کر ڈاکے ڈالنے لگے۔ لیکن مہارانی جی آپ بے شک پتہ کر سکتی ہیں..... ہم نے آج تک کسی گریب آدمی، کسی کسان یا جمہور کو نہیں ستایا۔ کسی بے گناہ کو نہیں مارا۔ ہم نے مہارانی جی کیول ان سیٹھوں، ساہوکاروں اور جمیداروں کو لوٹا ہے جو کھد جالم ہیں، مگر بیوں کا کھون چوستے ہیں، انگریجوں کے پنجو ہیں۔“

”مگر ایسا تھا تو تمھیں انگریجوں کے کھلا پھ (خلاف) ہتھیار اٹھانا چاہئے تھے۔“ رانی نے کہا اس کا لہجہ ایک دم نرم ہو گیا تھا۔

”کہاں تھے میرے پاس اتنے ہتھیار کہ میں انھیں انگریجوں کے کھلا پھ اٹھاتا۔“ ساگر سنگھ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”کہاں ہیں میرے پاس اس اتنے آدمی جن کے بل پر میں انگریجی فوج سے مکر لے سکوں؟“

”ہوں۔“ رانی کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ میں کچھ دیر بعد پھر تم سے بات کرتی ہوں۔“ کہہ کر اس نے سپاہیوں سے کہا۔ ”لے جاؤ۔“

سپاہی ساگر سنگھ کو لے کر چلے گئے۔ اب کمرے میں صرف رانی دیوان رگھوناتھ سنگھ، کنور گل محمد مندر اور موتی بانی رہ گئے۔ ”کیا کہتے ہیں آپ لوگ؟“ رانی نے سبھی کو مخاطب کیا۔

گل محمد اس طرح بولا جیسے بہت دیر سے بولنے کو بے تاب ہو.....

”مارانی ساب..... آپ مالک..... آپ حکمران..... آپ آقا..... ام سب تابعدار..... آخری فیصلہ آپ کا، اور ام سمجھتا کہ آپ کا فیصلہ ام سب کو قبول

اوغا..... مگر آپ دریافت فرمایا تو ام لب کشائی کرتا..... اپنا خیال ظاہر کرتا..... امارا خیال یہ ایسے کہ ساگر سنگھ کو ایک موقع عطا فرمایا جائے..... مہارانی سب اسے اپنا فوج میں شامل کر لیں۔ راجپوت کا پیچہ اے، فریب نہیں دے گا۔ میدان کارزار میں پشت نہیں دکائے گا۔ شجاع بھی ایسے۔ جانشی کو اپنا فوج میں ایسا مرد لوگ کا ضرورت ایسے۔ آگے مرضی مہارانی سب کا۔“

گل محمد خاموش ہو گیا۔

رانی اس کے کہے ہوئے ایک ایک لفظ پر غور کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ رگھوناتھ سنگھ کو مخاطب کر کے بولی۔ ”دیوان رگھوناتھ سنگھ، آپ کیا کہتے ہیں؟“

”میں کنور گل محمد خان کی رائے سے سہمت ہوں مہارانی جی۔“ دیوان رگھوناتھ سنگھ نے بڑے ادب سے کہا۔ ساگر سنگھ کو سزا دینے کے بجائے اس شرط پر معافی دے دی جائے کہ وہ اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ مہارانی جی کی فوج میں شامل ہو جائے۔ یہ سچ ہے کہ اس نے آج تک کسی غریب کسی مجبور، کسی کسان کسی کامگار کو نہ لوٹا ہے نہ ستایا ہے۔ بھوک، بے روزگاری اور تجوری نے اسے ڈاکو بنادیا ہے۔ میرے دیار میں مہارانی جی اسے ایک موقع ضرور دیں۔“

”اور ہماری موتی کیا کہتی ہے؟“ رانی نے مسکرا کر اپنے مخصوص پیار اور اپنائیت بھرے لہجے میں موتی بانی کو مخاطب کیا۔

”مہارانی صاحب“ موتی بولی۔ ساگر سنگھ ایک بھرا ہوا بھوکا شیر ہے۔ لیکن یہ بھوکا شیر کشتری بھی ہے۔ اور انسان بھی۔ اسے چار چیزیں درکار ہیں عزت، پیار، روٹی اور تحفظ..... اور یہ چاروں چیزیں اس کشتری زادے کو مہارانی صاحب عطا کر سکتی ہیں۔ آپ کی اس تاجیز کنیز کو کنور گل محمد کی رائے سے مکمل اتفاق ہے کہ رن میں ساگر سنگھ پشت نہیں دکھائے گا۔ دیوان صاحب ٹھیک فرماتے ہیں۔ ساگر سنگھ کو ایک موقع ضرور دیا جائے۔“

”مندر، تو کیا کہتی ہے؟“ رانی نے مندر کو مخاطب کیا۔

”مہارانی جی،“ شوخ اور چنچل مندر اس وقت بے حد سنجیدہ تھی۔ ”ساگر سنگھ کو مایچی (معافی) دے کر آپ اس پر ترس نہیں کھائیں گی بلکہ اسے عجت (عزت) دیں گی۔ ایک کشتری کو سب سے زیادہ بھوک..... عجت کی ہوتی ہے۔ آپ اسے عجت دیں۔ وہ سمنے پڑنے پر آپ کو اپنی جان دے دے گا۔ اور پیٹھ دکھانے کا تو پرش ہی نہیں اٹھتا۔ کنور گل محمد کھان ٹھیک کہتے ہیں۔“

مندر کا جملہ ختم ہوتے ہی رانی نے مندر سے کہا ”دیکھ جا کر کھانا تیار ہے کہ نہیں۔“

مندر باہر چلی گئی اور تقریباً فوراً واپس آکر بولی ”مہارانی جی، کھانا تیار ہے اور دوسرے کمرے میں لگایا جا رہا ہے۔“

رانی نے سر ہلایا اور گل محمد سے بولی ”کنور گل محمد، ساگر سنگھ اور اس کے سب ساتھیوں کو لائیں۔“

”جو حکم مہارانی سب“ گل محمد نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

ایک منٹ کے بعد ساگر سنگھ اور اس کے تمام ساتھی رانی کے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ ان کی پشت پر مضبوطی کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔

رانی نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔

مندر، موتی بانی، رگھوناتھ سنگھ اور گل محمد نے آگے بڑھ کر ان سب کے ہاتھ کھول دیئے۔ وہ سب خاموش تھے اور خاموشی سے گویا انتظار کر رہے تھے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔

جب سب کے ہاتھ کھل گئے تو رانی نے کہا ”تم لوگ جلدی سے باہر جاؤ اور ہاتھ منہ دھو کر کھانے کے کمرے میں آ جاؤ۔ سب ساتھ ہی بیٹھ کر بیٹھ گئے۔ ہم سب بہت بھوکے ہیں۔ تم لوگ بھی بھوکے ہو گے۔ مندر تم اور موتی ان لوگوں کو لے جاؤ اور ان کے ہاتھ دھو کر کھانے کے کمرے میں لے آؤ۔“

دس منٹ بعد وہ سب زمین پر آنے سانسے دو قطاروں میں بیٹھے ایک ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ یہ ان سب کی زندگی کا اہم ترین دن اور اس اہم ترین دن کا عظیم ترین وقت تھا۔ ان کی مہارانی، جھانسی کی رانی، لکشمی بائی ان کے ساتھ زمین پر بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ وہی کھانا جو وہ سب کھا رہے تھے، کدو کی سبزی پینگ اور ہلدی پڑی ہوئی چٹکے والی ارد کی دال اور سوکھی، توبے پر پکی اور انگاروں پر سکی ہوئی روٹیاں۔

وقت اپنے کو چاؤ دال کر رہا تھا۔

تاریخ خود کو تحریر کر رہی تھی۔

کھانا ختم ہوا۔ رانی ایک بار پھر سب کے ساتھ بیٹھک میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس بار بیٹھک میں رانی کے ساتھیوں کے علاوہ ساگر سنگھ اور اس کے دس ساتھی بھی شامل تھے۔

اس نے ایک اچنی سی نگاہ سسکی پر ڈالی اور بول ”میں یہاں زیادہ پر نہیں رک سکتی۔ رات ہونے تک مجھے ہر حال میں جھانسی پہنچنا ہے۔“ ایک لمحہ خاموش ہو کر اس نے کچھ سوچا اور ساگر سنگھ کو مخاطب کیا ”ٹھاکر ساگر سنگھ میں تمہیں اور تمہارے ان تمام ساتھیوں کو بجٹ کی جندگی جینے اور بجٹ کی موت مرنے کا موکا (موقع) دے رہی ہوں۔ تم اس موکے کو اپنا بھی سکتے ہو۔ گنوا بھی سکتے ہو۔ میری خبر میں آج سے ابھی سے، تم لوگ ڈاکو نہیں ہو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس سسے تک ڈاکو نہیں ہو جب تک پھر سے ڈاکہ ڈالنا شروع نہیں کر دیتے۔ آج سے تم میرے ساتھی ہو۔ اور اس سسے تک رہو گے، جب تک میں جندہ ہوں، یا جب تک تم اپنی پرانی جندگی میں لوٹ نہیں جاتے..... میری سینا میں تمہارا سواگت ہے۔ مگر یہ دیکھ لو کہ میں تمہیں کوئی تنخواہ (تنخواہ) نہیں دے سکوں گی، کسی کو بھی نہیں دے پا رہی ہوں..... صرف بجٹ ملے گی، جو سب کو مل رہی ہے، اور کھانا ملے گا جو سب کو مل رہا ہے۔ میں بھی وہ کھانا کھاتی ہوں جو میری سینا کے سارے لوگ کھاتے ہیں۔ ابھی اپنے گاؤں واپس جاؤ..... راستے میں اچھی طرح سوچ و چار کر لینا، صلاح مشورہ کر لینا۔ اگر میری

سینا میں شامل ہو کر میرے ساتھی بننا چاہو، انگریجوں سے دو دو ہاتھ کرنا چاہو، بجٹ کی جندگی جینا چاہو، بجٹ کی موت مرننا چاہو تو شام تک یہاں واپس آ جانا..... ہم سب ایک ساتھ جھانسی چلیں گے..... دوست بن کر، ساتھی بن کر.....“

رانی کا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی ساگر سنگھ اور اس کے دس ساتھی رانی کے قدموں میں گر پڑے۔ وہ سب رو رہے تھے۔ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ سرت آنسو بن کر ان کی آنکھوں سے ابل رہی تھی، ان ہچکیوں اور سسکیوں سے اپنا اظہار کر رہی تھی۔ اپنی رانی کے قدموں میں گر کر انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ انھوں نے آسمان کو جھولیا ہوا..... جیسے ان کے سارے پاپ دھل گئے ہوں، رانی نے ان سب کے سروں پر ہاتھ پھرے اور انھیں محسوس ہوا کہ ان کا ایک نیا جنم ہو گیا ہو۔ رانی کے پیروں کو ہاتھ لگا کر وہ سب بڑی تیزی سے رانی کی طرف چلے گئے۔ اور سورج غروب ہونے سے پہلے سب واپس آ گئے۔ صرف وہ گیارہ ہی واپس نہیں آئے تھے؟ ان کے ساتھ تیس لوگ اور تھے جو رانی لکشمی بائی کے لئے سرکنے کو آ گئے تھے۔

رانی نے سسے کے سر پر ہاتھ پھرے اور یہ چھوٹی سی فوج جھانسی کے لئے روانہ ہو گئی۔

زخمی خدا بخش بھی ساتھ تھا۔ ساگر سنگھ نے آگے بڑھ کر ہاتھ جوڑ کر بڑی ندامت کے ساتھ اس سے کہا تھا ”مجھے جھما کر دیجئے گا کنور ساب۔ میرے کارن آپ کو بہت کشت جھیلنا پڑے۔“

”ٹھاکر ساگر سنگھ۔“ کنور خدا بخش بڑی سنجیدگی سے بولا تھا ”اگر تمہارے جیسے لوگ ہماری مہارانی صاحبہ کو ملتے رہیں تو میں ساری زندگی ایسے کشت جھیلنے کو تیار ہوں“

”میں آپ کی مہانتا کو پر نام کرتا ہوں کنور ساب“ کہہ کر ساگر سنگھ نے جبک کر خدا بخش کے پیر جھوٹے تھے اور خدا بخش نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

- باغی عوام کو ردکنارائی کے بس سے باہر ہو جائے گا۔ اس لئے ڈنلپ اور مورس ولیم کے قتل کی خبر سن کر بھی اسکیں اور گارڈن خاموش رہے۔

”فکر نہ کرو گارڈن“ اسکیں نے گارڈن کا شانہ تھپک کر اسے تسلی دی ”وقت آئے گا، ہمارا وقت بھی آئے گا اور بہت جلدی آئے گا۔“

اسکیں نے یہ تسلی صرف گارڈن کو ہی نہیں دی تھی..... خود کو بھی دی تھی۔ تیسرے دن کمشنر اسکیں کو اطلاع ملی کہ رسالے دار کالے خاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ دلی چلا گیا ہے۔ عمدہ خبر تھی، مگر دور کرنے والی، مطمئن کرنے والی، خوش دینے والی۔ ہر انگریز کو اس خبر سے خوشی حاصل ہوئی، ہر انگریز نے راحت کی سانس لی۔ تمام انگریز عورتوں اور بچوں کو قلعے سے واپس بلایا گیا۔ اپنے اپنے گھر میں مقید انگریزوں نے باہر نکلتا شروع کیا، لیکن محتاط ہو کر۔

ایک صبح اسکیں کو خبر ملی کہ جیل کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک انگریز واکمن کو کسی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اسے یہ بھی پتہ چلا کہ گولی جیل کے اندر سے چلائی گئی تھی۔

اسکیں کے صبر کے پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے گارڈن کو اپنے بیگٹھ پر بلایا اور بولا ”چلو..... کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔“

”لیس سر.....“ ڈپٹی کمشنر نے اپنے افسر کی تائید کی۔ ”ہماری خاموشی سے ان ہندوستانی کتوں کے حوصلے کھلتے ہی چلے جائیں گے۔“

دونوں جیل پہنچے۔

پہرے داروں نے انھیں بڑے ادب سے سلیوٹ کیا اور گیٹ کھول کر دائیں بائیں ہو گئے۔

وہ دونوں اندر آگئے اور پہرے داروں اور سپاہیوں کے سلیوٹوں اور سلاموں کا جواب دے بغیر اپنی تنہی ہوئی گردنوں اور سرخ آنکھوں کے ساتھ صحن میں پہنچے۔ جیل کے وسیع و عریض صحن میں تمام قیدی ہتھاروں میں بیٹھے تھے۔ جیلر

## بارہواں باب

کیپٹن ڈنلپ اور لفٹیننٹ مورس ولیم کے قتل کی خبر اسکیں اور گارڈن کو مل چکی تھی، اور وہ دونوں دانت پیس کر رہ گئے تھے۔ ان دونوں کا بس چلتا تو جھانسی کے ایک ایک ہندوستانی مرد، عورت اور بچے کو قتل کر دیتے۔ لیکن ان کی تیز نگاہیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ جھانسی میں ان کے لئے حالات فی الحال سازگار نہیں تھے۔ انگریز عورتیں اور بچے قلعے میں رانی کی حفاظت میں تھے۔ اور انھیں یہ اطلاعات برابر مل رہی تھیں کہ قلعے میں پناہ گزین تمام انگریز عورتیں اور بچے پوری طرح سے محفوظ تھے۔ رانی کے کسی مرد ملازم یا افسر کا گزر اس حصے میں نہیں تھا جس میں رانی نے انگریز عورتوں اور بچوں کو رکھا تھا۔ انھیں اطلاع تھی کہ رانی کے محافظ خاص کر کتور گل محمد خان نے ایسا بدوبست کیا تھا کہ تمام پناہ گزینوں کو وقت سے کھانا اور ناشتہ ملتا رہے، ضرورت کی تمام چیزیں انھیں فراہم کی جاتی رہیں، انھیں کسی بھی قسم کی کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اسکیں اور گارڈن کو یہ بھی علم تھا کہ اس وقت جھانسی میں بہت تھوڑے انگریز بچے تھے اور ان کی زندگی بھی جھانسی کے باشندوں اور رانی کے وفاداروں کے رحم و کرم پر تھی۔ لوریوں ان دونوں انگریز افسروں پر یہ بات پوری طرح واضح تھی کہ اگر اس وقت انھوں نے کوئی چھیڑ چھاڑ کی، یا کوئی بھی غیر ذمے دارانہ قدم اٹھایا تو جھانسی میں موجود ایک ایک انگریز جن جن کو مار ڈالا جائے گا۔ عوام کچھ شروع ہونے کے منتظر تھے۔ اگر عوام نے بغاوت کر دی تو ان انگریز عورتوں اور بچوں کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی جنھیں اب تک رانی کا تحفظ حاصل تھا

تخصیص علی ایک طرف کھڑے اپنے نائب ڈپٹی جیلر ٹھاکر رام کھلاؤں سنگھ سے باتیں کر رہے تھے۔ ایک برہمن ست نارائن کی کھانا سارا ہاتھا۔

اسکین اور گارڈن کے وہاں بیٹھتے ہی برہمن خاموش ہو گیا۔ سارے قیدی دونوں انگریزوں کو دیکھنے لگے۔

”جیلر بخشش علی“ جاتے ہی اسکین دباڑا، جیل کے اندر سے کسی نے لولی چلا کر پیڑوا لٹکن کو ہلاک کیا ہے۔ کون تھا وہ؟“

”میں۔“ جیلر بخشش علی نے بڑے اطمینان اور بڑی لاپرواہی سے کہا ”میں نے گولی ماری تھی پیڑوا لٹکن کو۔“ انفسوس اس کا رہ گیا کہ اسکا بلیٹج کر بھاگ گیا۔“

اسکین اور گارڈن دونوں چونک پڑے۔ انھیں ایک ہندوستانی سے نہ اس لیے کی امید تھی، نہ اس لاپرواہی کی، نہ اس بے خوف اعتراف کی۔ یہ سب قطعی غیر متوقع تھا۔

بخشش علی کے اس لیے، اس لاپرواہی اور اس اعتراف نے دونوں انگریزوں کے کان کھڑے کر دئے اور ان دونوں کو فوری خطرے کا احساس ہوا۔ لیکن پھر بھی دیر ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں اپنی اپنی کمر میں لگے پستول کو نکالنے بخشش علی نے اپنا پستول نکال کر ان دونوں پر تان لیا۔

”ہاتھ اوپر کرو“ اس نے ان دونوں کو گھورتے ہوئے بڑے سرد لہجے میں کہا۔ ”تو جانتا ہے، ہم کون ہیں۔“ اسکین دباڑا۔ وہ کسی بھی قسم کی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس سے پہلے کہ جیلر بخشش علی اسے کوئی جواب دیتے ان کے نائب ٹھاکر رام کھلاؤں سنگھ نے آگے بڑھ کر ایک بھرپور تھپڑ اسکین کے منہ پر سید کیا اور بولا ”مسحید سو۔۔۔۔۔۔ یہ جھانسی کی جیل ہے، اور یہاں جیلر بخشش علی کا حکم چلتا ہے۔۔۔۔۔۔ اور ان سے نہ کوئی اس طرح سے بات کر تا ہے نہ تو کہتا ہے۔“

چھ فٹ لمبے اور پہلوان سے نظر آنے والے ٹھاکر رام کھلاؤں کا تھپڑ اتنا

زبردست اور اتنا غیر متوقع تھا کہ لاکھڑا کر گرنے کے بعد ہی اسکین کی سمجھ میں آیا کہ ڈپٹی جیلر نے اسے تھپڑ مارا تھا۔ اس کا جبر اہل کر رہ گیا تھا اور کھوپڑی میں دھماکے سے بھر رہے تھے۔

بہر حال دونوں انگریزوں کے چہرے مزید سفید ہو گئے۔ دونوں کے چہروں پر دہشت پھیل گئی۔ اسکین کا چہرہ زیادہ دہشت زدہ لگ رہا تھا۔

ٹھاکر رام کھلاؤں سنگھ نے آگے بڑھ کر دونوں انگریزوں کی کمر میں لگے ہوئے پستول نکال کر اپنے قبضے میں کئے اور بخشش علی سے بولا ”آپ کو اپنی وہ بے عزتی یاد ہے شیخ صاحب جو ان دو مسحید سوروں نے کی تھی۔؟“

”یاد ہے“ بخشش علی نے بڑے سرد لہجے میں کہا۔ اپنا پستول اپنی کمر کی پٹی میں لگایا اور آگے بڑھ کر دونوں انگریزوں کو اپنے بوٹ کی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ تقریباً دس منٹ تک وہ ”تو۔۔۔۔۔۔ پلیز۔ نو۔۔۔۔۔۔ فار گارڈز سیک“ کہتے، بلبلاتے اور منت کرتے، ان دونوں انگریزوں پر ٹھوکریں برساتا رہا۔ پھر جب وہ دونوں مار کھات کھاتے بے دم ہو گئے تو اس نے کمر سے پستول نکالا اور ایک ایک کر کے دونوں کو گولی مار دی۔۔۔۔۔۔ پہلے اسکین کو پھر گارڈن کو۔

اطلاع بھی تیسرے ہی دن جزل روز کو مل گئی تھی۔ اول تو جزل روز کے پاس جو بھی فوج اس وقت تھی وہ صرف کچھ سوانگریزوں پر مشتمل تھی، دوسرے یہ کہ کہیں سے بھی نی الحال مزید انگریز فوجی اس وقت حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ ہر طرف بغاوت ہو رہی تھی اور ہر جگہ انگریز فوجی بغاوت کو دبانے یا اغویوں کے عتاب سے بچنے کے لئے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ ان حالات میں اگر جزل روز اپنے چند سوانگریز فوجیوں کے ساتھ جھانسی پر حملہ کرتا تو اس کے ہاتھ شکست کے علاوہ کچھ نہ لگتا۔ دوسرے یہ کہ اس صورت میں قلعے میں محفوظ انگریز عورتوں اور بچوں کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جاتی۔ اس کا خیال ہی نہیں بلکہ اسے یقین تھا کہ اگر اس نے جھانسی پر حملہ کر دیا تو باقی اور جھانسی کے لوگ سب سے پہلے تو ان انگریز عورتوں اور بچوں کو مار ڈالیں گے۔ چنانچہ جزل روز خون کا گھونٹ پئے پیشاب۔ وہ کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن نی الحال بے بس تھا۔ پھر اسے کالے خان کے دلی چلے جانے کی خبر ملی، انگریز عورتوں اور بچوں کی قلعے سے واپسی کی خبر بھی ملی۔ اسے خوشی ہوئی۔ مگر تبھی اسے خبر ملی کہ اسکین اور گارڈن کو ہلاک کر دیا گیا جزل روز نے سر پکڑ لیا۔

ان دونوں انگریز افسروں کی موتیں ایسٹ انڈیا کمپنی کا نقصان تو تھیں ہی، جزل روز کا نجی نقصان بھی تھیں۔ اسکین اس کا قریبی دوست تھا، دونوں کا تعلق انگلینڈ کی ایک ہی کاؤنٹی یارک شائر سے تھا، دونوں ایک ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی میں بھرتی ہوئے تھے، ایک ساتھ ہندوستان آئے تھے، ایک ساتھ انھوں نے کلکتہ میں تربیت حاصل کی تھی اور پھر ایک ساتھ ہی انھیں کمپنی میں ان کی نجی لیاقت کی بنیاد پر ملازمت حاصل ہوئی تھی۔ ایک ساتھ دونوں کو افسری ملی تھی۔ گارڈن سے اس کی دور کی رشتہ داری بھی تھی اور اس کی بہن سے بڑی قریبی دوستی بھی۔ اس لئے اسکین اور گارڈن کی موت کی خبر سن کر پہلے تو جزل روز کو صدمہ پہنچا، پھر اس کی رگوں میں شعلے سے گردش کرنے لگے اور اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے چند سوانگریز فوجیوں کے ساتھ ہی جھانسی پر یلغار کر دے۔ لیکن پھر اس نے بڑی سختی سے خود پر قابو

## تیر ہواں باب

انگریزوں کے جاسوس جھانسی کی رتی رتی خبر اپنے سفید فام آقاؤں کو پہنچاتے رہتے تھے۔ جھانسی میں کیا ہو رہا ہے، عوام کیا سوچ رہے ہیں، قلعے میں کیا ہو رہا ہے، رانی کیا کر رہی ہے، رانی کے خاص اور قریبی لوگ کیا کر رہے ہیں..... ہر بات کی خبر انگریزوں کو ہو رہی تھی۔ انگریزوں کے یہ جاسوس کوئی غیر نہیں تھے، اپنے ہی لوگ تھے، ہندوستانی تھے، جھانسی کے ہی باشندے تھے۔ یہ لوگ اتنی چالاکی سے کام کرتے تھے اور اتنی ہوشیاری سے ایک ایک بات کی خبر انگریزوں کو پہنچاتے تھے کہ کسی کو ان پر شک تو خبر ہوتا ہی نہیں تھا، کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی تھی۔ ملک و قوم کے یہ غدار تمام خفیہ راز فرنگی تک پہنچا کر اپنے ہی ملک کی جڑیں کاٹ رہے تھے۔

اسکین اور گارڈن کی ہلاکت کی خبر بھی تیسرے ہی دن جزل روز تک پہنچ گئی جو جھانسی سے پچاس میل کے فاصلے پر کنائی نام کے ایک گاؤں میں کیمپ کئے ہوئے تھے اور موقع کا انتظار کر رہا تھا کہ کب حالات درست ہوں اور وہ اپنی فوج لے کر جھانسی پر دھاوا بولے۔

جزل روز کو علم تھا کہ کمشنر اسکین اور ڈپٹی کمشنر گارڈن نے جھانسی کا بندوبست رانی کے ہاتھ میں دے دیا تھا اور جھانسی کے حفاظت کی خاطر رانی کو اپنی فوج تشکیل کرنے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ اسے رسالے دار کالے خان کی بغاوت اور ڈنلپ کے قتل کی اطلاع بھی مل چکی تھی۔ جب اسکین کی درخواست پر رانی نے جھانسی میں موجود تمام انگریز عورتوں اور بچوں کو قلعے میں بلا کر اپنی محافظت میں لے لیا تھا تو یہ

پالیا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جذباتی ہو کر وہ اپنا نقصان تو کرے ہی، اپنی قوم کا نقصان بھی کرے گا۔ اسے علم تھا کہ اگر اس وقت اس نے جھانسی پر حملہ کیا تو اسے کراری شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ فتح کو تو ٹال سکتا تھا، لیکن..... شکست کا تصور تک اسی کے لئے باعث شرم تھا۔ سوال انگریزوں کی حکومت سے زیادہ انگریزوں کا تھا۔ کسی علاقے میں انگریزوں کی حکومت قائم نہ ہو سکے اس میں کوئی شک نہیں..... جنگ شکست میں تھی۔ جزل روز شکست نہیں چاہتا تھا۔ کامیابی کے سو فی صد یقین کے بعد ہی وہ جھانسی پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ اور اسے یہ اطلاعات بھی برابر مل رہی تھیں کہ جھانسی انگریزوں سے لوہا لینے کے لئے خود کو فولاد میں ڈھال رہی تھی، دن بہ دن خود کو طاقتور بناتی جا رہی تھی۔ یہ حالات اچھے نہیں تھے۔ جزل روز کی تشویش میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا تھا..... اگر جھانسی طاقتور ہو گئی تو اس پر فتح پانا اور اسے غلام بنانا بہت مشکل ہو جائے گا۔ اس لئے وہ جھانسی کو کمزور ہی دیکھنا چاہتا تھا۔

ایسے میں اسے اور چھاکے دیوان تھے خاں کی یاد آگئی۔

## چود ہواں باب

گل محمد کو راحت گڑھ سے جھانسی آئے ہوئے تقریباً چار سال ہو چکے تھے۔ راحت گڑھ میں وہ ایک کسان خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ آج بھی وہاں اس کے کھیت تھے جن میں باجرا اور مکئی کی کاشت ہوتی تھی..... اور انگریز فوجی اور افسر جب چاہتے دوسرے کھیتوں کے ساتھ ساتھ اس کے کھیتوں کو بھی اپنے شکار کے شوق میں روند کر رکھ دیتے تھے اسے بچپن سے ہی انگریزوں سے شدید نفرت تھی اور اس کا بس چلتا تو وہ ہندوستان میں موجود ہر انگریز کو موت کے گھاٹ اتار دیتا۔

اس کے والد نے بچپن میں ہی اسے راحت گڑھ کے ”مدرسہ تعلیم القرآن“ میں داخل کر دیا تھا جہاں آٹھ سال تک اس نے فارسی، اردو اور عربی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ وطن کیا ہوتا ہے، وطن کے تئیں فرائض کیا ہوتے ہیں اور انسان کی زندگی میں وطن کی کیا اہمیت اور کیا مقام ہے، ان تمام باتوں کا علم و ادراک اسے دھیرے دھیرے مدرسہ تعلیم القرآن میں ہی ہوا تھا۔ شیخ المدرسہ مولانا عبدالرحیم خاٹھای ایک نیک اور دیندار مسلمان اور جید عالم تھے۔ انھوں نے قرآن و حدیث کا مطالعہ ہی نہیں کیا تھا، انھیں سمجھائی نہیں تھا بلکہ اسلامی تعلیمات کو اپنی زندگی میں اتار بھی تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک مدرس تھے اور ان کا قول تھا کہ کسی مدرس کو اپنے طلبہ کو ایسی کوئی بھی تعلیم دینے کا اخلاقی یا منہجی حق نہیں جس پر وہ خود عمل نہ کرتا ہو۔ مثلاً اگر استاد خود تمباکو نوشی کرتا ہے تو اسے اس بات کا کوئی حق نہیں کہ وہ اپنے طلبہ کو تمباکو نوشی سے منع کرے۔ مولانا خود روزانہ مدرسے میں بچوں کو پڑھاتے تھے اور اس لئے مدرسے میں آنے والے بچے صحیح معنوں میں ان سے استفادہ حاصل



کرتے تھے۔ مدر سے آنے والے ان بچوں میں گل محمد بھی تھا۔

اس نے بھی مولانا عبدالرحیم خانقاہی کے سامنے زانوئے لادب تہہ کئے تھے اور ان کے قدموں میں بیٹھ کر علم حاصل کیا تھا، قرآن وحدیث کو سمجھا تھا اور انھیں اپنی زندگی کا رہنما بنایا تھا۔ چودہ برس کی عمر میں جب وہ مدر سے تعلیم حاصل کر کے نکلا تھا تو وطن کی محبت اس کا نصف ایمان ہو چکی تھی۔ بیس برس کی عمر کو پہنچتے پہنچتے اسے ملک کے حالات کا مسلک کی کمزوری کا، ملک کی غلامی کا، انگریزوں کی مکاریوں کا، ان کی چال بازیوں کا، ان کے رویے کا، ان کی ذہنیت کا ان کے ارادوں کا، ان کی حکومت کا..... ہر چیز کا علم ہو چکا تھا۔ وہ دیکھتا تھا کہ انگریز کس طرح ہندوستانیوں سے نفرت کرتے تھے، انھیں کتنا حقیر سمجھتے تھے، کس طرح انھیں بے عزت کرتے تھے اور کس بے دردی سے ان کے کھیتوں کو روندتے تھے۔ وہ ہندوستانیوں کی اپنے برادران وطن کی ناچاریوں اور مجبوریوں کو بھی دیکھتا تھا اور خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے پیر کمزور اور بے بس ہندوستان میں پھیلنے لگے۔ اور گل محمد کے دل میں ان سفید فام سوداگروں کے لئے نفرت میں اضافہ ہو تا گیا جو سات سمندر پار سے اس ملک میں سوداگر بن کر آئے تھے اور حکمران بن بیٹھے تھے۔ گل محمد کا جی چاہتا تھا کہ وہ راحت گڑھ چھوڑ کر کہیں چلا جائے۔ بخور، گوالیا، جھانسی، کالچی..... کہیں بھی..... جہاں اسے انگریزوں سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقع مل جائے..... اور وہ کہیں چلا بھی جاتا، مگر تبھی اُس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ پانچ جوان کنواری بہنوں اور ماں کی ذمہ داری اس کے شانوں پر آ پڑی۔ اس وقت اس کی عمر 26 برس تھی۔ اسے کہیں بھی جانے کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ اس کے اندر سے ایک آواز آئی تھی ”گل! جب تک تو اپنی بہنوں کی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہو جاتا اس وقت تک تجھے راحت گڑھ چھوڑنے کا کوئی حق نہیں۔“ گل محمد نے اس آواز کے آگے سر جھکا دیا تھا کیونکہ اسے محسوس ہوا تھا جیسے اس کے اندر سے آنے والی وہ آواز فرمان ربانی ہو۔ وہ پوری دلجمعی کے ساتھ اپنے کھیتوں میں محنت کرتا رہا، مٹی، جوار اور باجرا لگا کر ہر سال ایک بہن کی شادی کرتا رہا۔

جب اس کی تیسری بہن کی شادی ہو گئی اور وہ رخصت ہو گئی تو سیکینہ نے دیر سے کہا ”اپنا زندگی کا بارے میں کب سوچو گے؟“

سیکینہ احمد خان کی بیٹی تھی اور گل محمد کے پڑوس میں رہتی تھی۔ عمر میں وہ گل محمد سے چھ برس چھوٹی تھی۔ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے تھے..... اور ایک دوسرے کو کتنا چاہتے تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا تھا کہ سیکینہ کے تصور میں لڑکپن سے لے کر جوانی تک گل محمد کے تصور میں جب بھی کوئی عورت ابھری تھی تو وہ صرف سیکینہ تھی۔ بہت کھلے ہوئے گورے رنگ، تندہ رست جسم، کشادہ پیشانی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی سیکینہ جب اپنی لمبی لمبی پٹلیں اٹھا کر گل محمد کو دیکھتی تھی تو گل محمد کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اسے دنیا کا ہر مکھ حاصل ہو گیا ہو، جیسے اس کی دنیا ہی سمٹ کر سیکینہ کی خاموش نگاہوں میں آ بسی ہو..... جیسے نہ تو ان نگاہوں کے اس طرف کچھ ہے نہ اس طرف..... جیسے کائنات ان نگاہوں پر تمام ہو گئی ہو..... لیکن گل محمد کی ذمہ داریوں نے اسے کبھی جذباتی نہیں ہونے دیا۔ والد کے انتقال کے بعد اس نے تمام ذمہ داریاں بڑی خاموشی سے اور بغیر کسی ناگواری بغیر کسی بے زاری یا بنفیر کسی شکایت کے قبول کر لی تھیں، اور بڑی تندہی اور بڑی چابکدستی سے انھیں نبھا رہا تھا۔ اس نے خدا سے کبھی یہ شکوہ نہیں کیا تھا کہ اس نے اتنی بہت سی ذمہ داریاں اتنی کم عمر میں اس پر ڈال دی تھیں، بلکہ وہ دل سے اللہ جل شانہ کا شکر گزار تھا کہ اس مالک بے نیاز نے اسے اس قابل سمجھا کہ وہ ذمہ داریاں اٹھائے گا۔ اسے فخر تھا کہ اللہ غفور الرحیم نے اس پر اتنا کرم فرمایا کہ اتنی بہت سی ذمہ داریاں دے دیں۔ وہ ہر سانس اللہ کا شکر ادا کر کے ذمہ داریاں اٹھاتا رہا، اور اللہ اس پر کرم فرماتا رہا، اس کی مشکلیں آسان ہوتی رہیں، ایک کے بعد ایک ذمہ داری سے وہ سبکدوش ہو تا گیا، تین بہنوں کی شادیاں اس نے کر دیں۔ اس کے علاوہ اس نے وہ تمام قرض بھی ادا کر دیے جو اس کے والد چھوڑ گئے تھے۔ دو سال سوکھا پڑا تھا، فصلیں

”ہاں سیکڑ بی..... ام تھار ا مطلب سمجھتا..... لیکن ام کیا کرے؟ طبعیت نہیں ٹھیرتا..... ام کیسے کوئی وعدہ کرے..... کیسے کوئی قول دے؟ ام؟..... ایک آواز سنتا..... روز بی سنتا..... شب بی سنتا..... وطن ام کو پکارتا..... ام کیا کرے؟ سیکڑہ امارا ساتھی..... امارا اپنا..... ام کو بتاؤ ام کیا کرے؟ امارا جہنماں فرماؤ..... گل محمد نے دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں دپائیں۔

”ام جاننا خان.....ام جاننا ایے کہ غلامی کا یہ مکروہ حیات تم کو گوارہ نہیں.....ام جاننا کہ وطن تم کو شب و روز صدا دیتا۔ تم وئی کرو جو تمارا دل کہتا تارا  
ضمیر کہتا۔ وطن سیکند سے بوت بڑا ایے۔ ام ایے بی جاننا کہ سیکند سے وطن  
نہیں.....وطن سے سیکند ایے۔“

گل محمد حیرت سے یکینہ کو دیکھنے لگا۔ حالانکہ یکینہ نے بھی آٹھ برس تک مدرسے میں تعلیم حاصل کی تھی، پھر بھی جو کچھ اس نے ابھی کہا تھا اس کی توقع گل محمد کو اس سیدھی سادی، خاموش رہنے والی، مریٹو لکسان لڑکی سے نہیں تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے پھر اللہ غفور الرحیم کا شکر ادا کیا کہ کچھ عرصے کے لئے ہی سہی مگر اس مالک بے نیاز نے اس گنہگار بندے کو ایک اتنی عظیم لڑکی سے واقفیت حاصل کرنے اور اسے چاہنے کا موقع عطا فرمایا تھا۔

”ایسے مالک دو جہاں..... ایسے رب جلیل، ایسے نہایت مہربان، ایسے انتہائی رحم والے، واقعی تیرے کرم کی نہ حد ہے نہ انتہا۔ تیرا لاکھ لاکھ شکر ایسے پاک پروردگار، تیرا لاکھ لاکھ شکر..... پروردگار..... اس نیک دل اور فرشتہ مفت لڑکی کو تاحیات ہر مسرت سے ہنسنا رکھنا۔ ایسے معبود حقیقی ایسے دعاؤں کو قبول کرنے والے، اما رب دعا قبول فرما..... تیرا لاکھ لاکھ شکر ایسے رب اتم تیرا لاکھ لاکھ شکر اے“ دعا مانگ کر مغل

تباہ ہو گئیں تھیں اس لئے اس کے والد قرضدار ہو گئے تھے مگر گل محمد کی جان تُوڑ  
محنت رگ لائی، بھرپور فضلیں ہوئیں، تمام قرض ادا ہو گئے۔ لیکن ابھی دو نہیں باقی  
تھیں۔ اپنے بارے میں کچھ سوچنے کا ابھی سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔

چنانچہ اس دن جب سکیئنہ نے کہا ”اپنا زندگی کا بارے میں کب سوچو گے؟“ تو اسے اپنی زندگی یاد آئی جس کا ہر گوشہ سکیئنہ سے پر تھا۔ لیکن اسے اپنی زندگی سے زیادہ اپنی ذمے داریوں کا احساس تھا، اپنی زندگی سے زیادہ اپنی ذمے داریاں عزیز تھیں اس لئے اس نے ایک طویل سانس لے کہا ”سکیئنہ بی، ابلی مشکور اور منصور کی شادیاں کرنی ہیں جب تک ان ذمے داریوں سے سبکدوش نہیں ہو جاتا اس وقت تک اپنا زندگی کا بارے میں سوچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”تسلیم“ کیلئے کی آواز میں بڑا ٹھہرا ہوا تھا۔ ”ام کو بے پیاں مسرت ایسے کہ تم کو اپنا زے دواړو کا اتنا احساس ایسے خان۔ مگرام تو یہ جانا چاہتا ہتی کہ مشکور اور منصور کا شادی کے بعد لی کیا تم اپنے بارے میں سوچو گے؟“

گل محمد نے جواب نہیں دیا۔ وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ کافی دیر کیلئے جواب کا انتظار کرتی رہی، پھر وہ کچھ کہنے جا رہی تھی کہ گل محمد نے اپنی خاموشی توڑی۔

”کیلئے بی، ام کیا بتانے؟ کیا بولے؟ ہمارا سمجھ میں نہیں آتا۔ ام الجھ گیا ہے، ام..... ایک الجھن..... ایک کشمکش.....“

”ام تمہارا الجھن بی سمجھتی خان، تمہارا کنکاش بی۔“ سکیزن نے اس کی بات کاٹ کر اپنے ٹھہرے ہوئے لہجے اور اپنی پرسکون آواز میں کہا۔ ”وطن کا الفت..... اور تمہارا قلب میں وطن کا الفت جوش مارتا..... اور تمہارا نظر کا سامنے فرنگی کا حکومت تم کو بناوت کے لئے لٹکارتا..... ام سمجھتی..... ام سب جانتی..... بچپن سے ای تم کو محسوس کرتی آئی ایے..... تم مختلف ایے..... بہت مختلف ایے..... ام تمہارا عظمت کو سلام کرتی..... مگر بابا بولے تاکہ..... اب او اور زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔ امدارتیوں بڑا بین کا شادی اوگیا۔ اب ام باقی..... بابا اپنا حیات میں امدار شادی بی کر دینا

میں بالکل اسی طرح حصہ لیا تھا جیسے ہستی کے دوسرے لوگوں نے لیا تھا۔ پھر سب بھیڑ جھپٹی چلی گئی۔ گل محمد بارات کی واپسی دیکھتا رہا۔ جب موڑ پر بارات کا آخری آدمی بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو گل محمد اپنے اس سے قدموں مگر بے تاثر چہرے کے ساتھ اپنے گھر چلا آیا۔ وہ کہانی ختم ہو گئی تھی جس کے متعلق اسے یاد بھی نہیں تھا کہ کب شروع ہوئی تھی۔

سکینہ اس کہانی کو ماضی کے آگن میں بڑی گہرائی میں دفن کر کے گھر سے رخصت ہوئی تھی۔ تیل گاڑی، جس میں وہ دلہن بنی بیٹھی تھی، اپنی دھیمی رفتار سے چلتی رہی۔ تیل گاڑی کے پہیوں کا ہر چکر اسے اس کے ماضی سے دور اور مستقبل سے قریب کر رہا تھا۔ بالآخر پہیوں کے چکر تمام ہوئے۔ تیل گاڑی ٹک گئی۔ سکینہ ساون پور میں تھی۔ اس کا ساون پور..... اس کا حال..... اس کا مستقبل۔

پوری ایمان داری، محبت اور فرض شناسی کے ساتھ سکینہ نے اپنی نئی زندگی شروع کی۔

پوری ایمان داری، محبت اور فرض شناسی کے ساتھ گل محمد اپنی زندگی جینے لگا۔ اس نے اپنے کو اتنا مصروف کر لیا کہ اسے اس ذہنی روٹی اور اذیت کو محسوس کرنے کا وقت ہی نہ ملے جو اس خلانے عطا کی تھی جو سکینہ کے جانے کے بعد اس کی زندگی میں در آئی تھی۔

ایک سال بعد اس نے اپنی پانچویں بہن منصورہ کی شادی بھی ایک معقول لڑکے سے کر دی۔

ماں شاید یہی سکھ دیکھنے کے لئے اب تک زندہ تھیں۔ منصورہ کی شادی کے بعد انھوں نے بلند آواز میں اللہ کا شکر ادا کیا اور ایک دن خاموشی سے اپنے رب سے جا ملیں۔ اب گل محمد غلامی سے لڑنے کے لئے آزاد تھا۔

اس نے اپنے رب کا شکر ادا کیا کہ اس غفور الرحیم نے اس گنہگار بندے پر کرم فرمایا، اسے ذمے داریاں عطا فرمائیں، مزید کرم فرمایا، ان ذمے داریوں کو پورا کرنے کا

محمد نے آنکھیں کھولیں، سکینہ کی نگاہیں اسی پر مرکوز تھیں۔

کچھ دیر وہ خاموشی سے اپنے بچپن کے ساتھی کو دیکھتی رہی پھر اس کے ہونٹ بڑے خلوص کے ساتھ ہلے۔ ”خداوند قدوس تمہارا ارشاد پورا کرے، ارزئے داری سے تم سبکدوش او جاؤ، ار قدم پر کامیابی تمہارا قدم بوسی کرے، پروردگار تم کو عمر طویل اور عمدہ صحت عطا فرمائے۔ آمین۔ اللہ نگہدار!“

سکینہ چلی گئی اپنے پیچھے اپنی عظمت کی بہت سی خوشبو چھوڑ گئی تھی۔ اس خوشبو نے گل محمد کو سرور و بخشش، لیکن اس کے ارادوں کو کمزور نہیں کیا، اس کے حوصلوں کو پست نہیں کیا، بلکہ اس کے ارادوں کو اور مضبوطی عطا کی، حوصلوں کو اور استحکام بخشا۔ اس نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ سکینہ جذباتی نہیں ہوئی، ورنہ زندگی کتنی مشکل ہو گئی ہوتی۔

سکینہ گل محمد کو جانتی تھی۔ پہچانتی تھی، سمجھتی تھی، محسوس کرتی تھی، اسے علم تھا کہ وہ ہمیشہ سے گل محمد کی جاہت کا واحد مرکز رہی ہے۔ اس لئے وہ کچھ کہہ کر اپنا دکھ ظاہر کر کے اپنے گل کی کمزوری نہیں بننا چاہتی تھی، خاموش رہ کر اس کی طاقت بننا چاہتی تھی۔ اسلئے جب اس کے والد احد خان نے شادی کے لئے اس کا عندیہ لیا تو اس نے چپ چاپ ہاں کہہ دیا۔

ادھر گل محمد نے اپنی بہن مشکورہ کی شادی کی اور سکینہ کی شادی پڑوس کے گاؤں ساون پور کے ایک شریف نوجوان اسلم خان سے ہو گئی جس نے آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی، سمجھتے کرتا تھا اور مرغیاں پالتا تھا۔ سکینہ کی شادی میں گل محمد نے اسی طرح شرکت کی تھی جیسے ہستی کے کسی دوسرے ہر شخص نے کی تھی۔ سکینہ کا نکاح ہوا، باراتیوں کی عمدہ دعوت کی گئی۔ بہترین خاطر مدارات کی گئی او پھر رخصتی کا وقت آ گیا۔

سب کچھ دل میں دبائے چھپائے سکینہ بالکل اسی طرح سے رخصت ہوئی جیسے ہر لڑکی ہوتی تھی۔ گل محمد نے بھی قطعی غیر جذباتی انداز میں سکینہ کی رخصتی

حوصلہ عطا فرمایا، قوت سے نوازا اور اس کے کرم سے آج وہ اپنی تمام گھریلو ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گیا تھا..... اب وہ وطن کی خدمت پوری دل جمعی کے ساتھ کر سکے گا۔ وہ سوچنے لگا کہ کہاں جائے۔ یہاں راحت گڑھ میں کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ یوں تو وہ خود ہی اپنے کردار اور خیالات کے سبب راحت گڑھ کے جوانوں کا آدرش تھا، لیکن وطن کی آزادی کے حصول کے لئے انگریزوں سے جنگ کرنے کے لئے جس قیادت کی ضرورت تھی وہ قیادت راحت گڑھ کے جوانوں کو دینے کا اہل وہ نہیں تھا۔ اور اس حقیقت سے وہ لاعلم بھی نہیں تھا۔ اُسے اپنی جرأت، اپنے حوصلے اور اپنی طاقت کا علم تھا، لیکن وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کسی کی قیادت میں تو وہ انگریزوں سے جنگ کر سکتا تھا، لیکن خود قائد بن کر جنگ کرنا اس کے لئے مشکل ہی نہیں، ناممکن تھا۔ وہ سپاہی بن سکتا تھا، قائد نہیں، وہ قائد بننا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اسکے ذہن پر یہ امر واضح تھا کہ انگریزوں سے لوہا لینے کے لئے ایک منظم اور منصوبہ بند جنگ کی ضرورت تھی، ایک ایسی جنگ جس کی قیادت ایک باصلاحیت ذہین، مدبر رہنما کے ہاتھ میں ہو۔ راحت گڑھ نے جوان پیدا کئے تھے، طاقتور پیدا کئے تھے، لیکن وہ جوانی وہ طاقت کبھی تو اور چھوٹے موٹے کاموں تک محدود تھی۔ راحت گڑھ اپنی پیدا کردہ جوانی اور طاقت کو کوئی بڑا میدان عمل کبھی نہیں دے سکا تھا..... سو رماؤں کا یہ خط خود کبھی کوئی تربیت گاہ نہیں بن سکا تھا۔ راحت گڑھ میں امیر خان جیسے لوگ تو تھے جو جوانوں کو جنگ کے لئے تیار تو کر سکتے تھے لیکن جنگ کی منصوبہ بندی وہ بھی نہیں کر سکتے تھے..... اس لئے اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہوتے ہی گل محمد سوچنے لگا کہ وہ کہاں جائے..... بھور، مانا صاحب کے پاس، دیتا، تاتیا ٹوپے کے پاس، یا جھانسی، رانی لکشی بانی کے پاس؟ تا صاحب اطلاع دے کے رہنا تھے..... گل محمد کے آدرش تھے۔ تاتیا ٹوپے شجاعت کا ستون تھا..... گل محمد کا آدرش تھا لیکن آزادی کے متوالے راحت گڑھ کے اس پشیمان کی سب سے بڑی آدرش رانی لکشی بانی تھی جو انیس برس کی کسی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ اور گود نہ لینے کا قانون بنا کر

انگریزوں نے اس کا راج بڑپ لیا تھا۔ لیکن گل محمد اس حقیقت سے بھی واقف تھا کہ انگریز سب سے زیادہ خوفزدہ بھی رانی لکشی بانی سے ہی تھے۔

ابھی گل محمد فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ بھور، دیتا یا جھانسی..... کہاں کے لئے رخت سفر باندھے کہ اسے غلام غوث خاں کا خط ملا جو اس نے راحت گڑھ کے ایک بزرگ کے ہاتھ بھجوایا تھا.....

”پیدے بھائی گل محمد..... سلامتی و رحمت۔ الحمد للہ اچھا ہوں۔ ملک کے حالات سے تم واقف ہو۔ جلد ہی ہمارا عظیم ملک کروٹ بدلے گا۔ اب عزیزہ منصورا کی شادی بھی اللہ جل شانہ کے کرم سے ہو گئی ہے۔ شرکت نہیں کر سکا۔ افسوس ہے۔ چچی خانم کے انتقال کی خبر بھی ملی تھی۔ قائدہ و قالیہ راجعون۔ اللہ انھیں جنت الفردوس میں مقام عطا فرمائے۔ نہایت نیک خاتون تھیں۔ ان کی وفات میرا بھی نجی نقصان ہے۔ بہت عزیز رکھتی تھیں مجھے۔ اب تم آزلو ہو۔ ہماری جھانسی پر برے دن آئے ہوئے ہیں۔ مہارانی صاحبہ کی حکمرانی صرف اہل جھانسی کے دلوں پر رہ گئی ہے۔ انگریزوں نے سب کچھ لے لیا۔ ایسے میں اگر تم جھانسی آ جاؤ تو مجھے اور ہم سب کو خاصی قوت حاصل ہوگی۔ میں نے مہارانی صاحبہ سے تمھارا ذکر کیا تھا۔ انھوں نے فرمایا..... میں نے راحت گڑھ کے وفادار بھائیوں کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ مجھے خوشی ہوگی اگر گل محمد جھانسی آجائے۔ مگر میں کوئی تنخواہ نہیں دے پاؤں گی۔ اسے بتا دیتا۔

کیا راحت گڑھ کا گل محمد انیس برس کی بیوہ، بے سہارا اور معزول رانی سے تنخواہ لے گا؟

اللہ تمھیں سلامت رکھے۔

تمہارا

غلام غوث خاں۔

غلام غوث خاں گل محمد کا دور کارشتے دار تھا اور اس کے دل کے بے حد قریب تھا۔ بہت عرصے سے جھانسی میں، رانی لکشی بانی کی خدمت میں تھا۔

گل محمد نے غلام غوث خان کا خط پڑھا تھا اور دوسرے دن جہانسی کے لئے روانہ ہو گیا تھا۔

اور وہ گل محمد کی زندگی کا عظیم ترین اور ناقابل فراموش لمحہ تھا جب غلام غوث خان نے اسے رانی کشمی بانی کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس نے ایک نگاہ رانی پر ڈالی تھی اور حیرت میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں، گول چہرے، پھولے پھولے گالوں، گندی رحمت، بھرے بھرے مضبوط جسم اور میانے قد کی یہ لڑکی رانی کشمی بانی تھی جو کہانی کی طرح دور دور تک پھیلی ہوئی تھی، قصے کی طرح مشہور تھی! رانیاں ایسی ہوتی ہیں!!

کہاں ہے تاج؟

کہاں ہیں پیشانی کے تل؟

کہاں ہیں چرمی ہوئی تیوریاں؟

کہاں ہے غوث؟

یہ اتنی دم سازی کیوں لگ رہی ہے؟

یہ تو اوپر سے نیچے تک نرمی ہی نرمی نظر آرہی ہے!

اندر سے باہر تک محبت ہی محبت دکھائی پڑ رہی ہے!

یہ اس کی آنکھوں میں ماں کی ممتا جیسا کیا ہے؟

یہ اتنی اپنی سی کیوں لگ رہی ہے؟

گل محمد اسی دم رانی کشمی بانی کا غلام ہو گیا تھا۔

اور رانی نے اسی لمحے اسے اپنا ساتھی بنالیا تھا۔

اور اب اس واقعے کو تقریباً چار برس گزر چکے تھے۔ کبھی کبھی راحت گڑھ یاد آتا

تھا وہاں سبھی سے وہ واقف تھا، سبھی اس سے واقف تھے۔ سبھی اس کے اپنے تھے، سب یاد آتے تھے، دوست بھی، رشتہ دار بھی، جوان بھی، بزرگ بھی، بچے بھی۔

اسے سندیر ملا کہ اس کی پیچازاد بہن نسیم کی شادی تھی۔ دن تارخ بھی طے

ہو چکا تھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ وقت اتنی جلدی گزر گیا۔ جب وہ راحت گڑھ سے آیا تھا تو نسیم تیرہ چودہ برس کی ایک الہڑ، کھلڈی، شوخ اور باتونی لڑکی تھی جو سارا دن اپنے گھر کے آگن میں مکے کی لڑکیوں کے ساتھ لنگڑی ٹانگ کھیتی رہتی تھی، ساون کے مہینے میں سارا سارا دن باغ میں سہیلیوں کے ساتھ جھولا جھولتی رہتی تھی، اچھل پھاند بچائے رہتی تھی۔ آج اس کی شادی کا دن بھی مقرر ہو گیا تھا۔ وہ گل محمد سے بہت مانوس تھی۔ اس نے کہلا بھیجا تھا کہ اگر بھائی گل خان نہیں آئیں گے تو وہ اپنے گھر سے رخصت نہیں ہوگی۔ ”وہی آکر فیس میں بٹائیں گے تبھی بیٹھوں گی۔“ بچپن سے ہی وہ اسے ”بھائی گل خان“ کہتی تھی۔

سندیر پا کر گل محمد ابھن میں پڑ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ نسیم ضدی لڑکی تھی۔ جو کہتی تھی کر گزرتی تھی۔ اگر وہ اس کی شادی میں نہیں گیا تو اپنے ”بھائی گل خان“ کو ٹوٹ کر چاہنے والی وہ الہڑ لڑکی کوئی نہ کوئی ہنگامہ ضرور کھڑا کرے گی۔ دوسری طرف گل محمد یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ جہانسی کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ بغاوت ہو چکی تھی اور وہ دیکھ رہا تھا کہ رانی کو ہر وقت اس کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سنسوس کر رہا تھا کہ رانی کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں، اس لئے وہ خود بھی ایسے حالات میں رانی کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا، حالانکہ رانی کے ارد گرد اس کے بہت سے وفادار اور جاں نثار موجود تھے۔

اس نے رانی سے ذکر نہیں کیا کہ اسے راحت گڑھ جانا ہے۔ مگر غلام غوث ناں نے کر دیا۔

اور رانی نے گل محمد کو بہت ڈانٹا کہ اس نے ذکر کیوں نہیں کیا کہ اس کی چچا بہن کی شادی ہے اور بہن نے اتنا پیارا سندیر بھیجا ہے۔ پھر اس نے اس دن گل محمد کو زبردستی راحت گڑھ بھیج دیا۔

”غریب (غریب رانی کی طرف سے چاندی کے یہ کڑے بہن کو دے دینا۔“ گل محمد نے بڑے احترام سے لیکن بہت جلدی سے کڑے لے لئے تھے اور

اس سے بھی زیادہ جلدی سے رانی کے پاس سے چلا آیا تھا۔ اگر ایک لمحہ بھی رانی کے سامنے ٹھہر تا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔

گل محمد راحت گڑھ کیا آیا، جیسے اس کے تمام رشتے داروں کی عید ہو گئی۔ جس نے سنا، اس سے ملنے آیا۔ سبھی دوست، سبھی شاسا ملے آئے۔ اس نے سبھی سے صرف ایک بات کہی، ”کسی وقت ہی ام بلاوا بیچے گا..... جانی آکر تکلیفیں جھیلنے کا واسطے ابی سے خود کو تیار کرنا شروع کر دو۔“

ہر شخص نے وعدہ کر لیا۔

گل محمد جانتا تھا کہ یہ راحت گڑھ کے پٹھانوں کا وعدہ ہے۔ جو وفا ہو کر ہی رہے گا۔ وہ راحت گڑھ کے مزاج سے واقف تھا، راحت گڑھ کے کردار سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ راحت گڑھ کا کوئی جوان ایسا کوئی وعدہ کرنا ہی نہیں جیسے وہ پورا نہ کر سکے۔

اسے بڑی طمانیت کا احساس ہوا۔ نیسہ کی شادی ہو گئی۔ گل محمد نے اپنے ہاتھوں سے اُسے ڈول میں بٹھایا، اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ دعا دی اور پیچھے ہٹ آیا۔ ڈول نیسہ کو لے کر چلی گئی۔

گل محمد اسی دن جھانسی کے لئے روانہ ہو گیا۔

وہ جلد از جلد جھانسی پہنچنا چاہتا تھا۔ راحت گڑھ آنے سے قبل وہ رانی کی، محل کی اور قلعے کی حفاظت کا پورا بندوبست کر آیا تھا اور اسے ان تمام لوگوں پر مکمل اعتبار و اعتماد تھا جنہیں وہ پہلے سے اور حفاظت کی ذمہ داری سونپ کر راحت گڑھ کے لئے روانہ ہوا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ جلد از جلد جھانسی پہنچ جانا چاہتا تھا۔ رانی کا تحفظ اس کی نگاہ میں سب سے مقدم تھا۔ جھانسی میں اور رانی کے اتنا قریب رہ کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ آزادی کی جنگ کی قیادت اگر سونی صمد موثر طریقے سے کوئی کر سکتا تھا تو وہ اُس کی ”مارانی سب“ تھیں۔ اس لئے وہ ایک لمحے کے لئے بھی جھانسی سے دور نہیں رہنا چاہتا تھا، اپنی ”مارانی سب“ کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی اسے راہ میں کچھ گھنٹوں کے لئے رکنا پڑا۔

## پندرہواں باب

وہ راستے میں کچھ دیر کے لئے کالپور کی سرائے میں ٹھہرا اور کھانا منگوا کر کھایا۔ کھانا کھا کر وہ فوراً ہی جھانسی کے لئے روانہ ہونا چاہتا تھا۔ لیکن باہر اُس بھری تیز دھوپ پھیلی تھی..... اور اس کے سر میں شدید درد تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر اس اُس بھری دھوپ میں اس نے سفر جاری رکھا تو سر درد میں اضافہ ہو جائے گا اور جھانسی پہنچنے سے پہلے ہی وہ بیمار ہو جائے گا، وہ بیمار نہیں پڑنا چاہتا تھا، کم از کم راستے میں تو ہرگز نہیں۔ اس لئے اس نے ایک گھنٹہ سرائے میں ہی آرام کرنے کا فیصلہ خالی کیا۔ ایک گھنٹہ آرام کر کے بھی وہ رات تک جھانسی پہنچ سکتا تھا اس لئے وہ ایک خالی کمرے میں گیا اچھا صاف ستر اکمرہ تھا۔ سامنے دروازے سے روشنی آ رہی تھی۔ اس نے دروازہ بند کیا اور چارپائی پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ کافی راحت کا احساس ہوا اور وہ اٹکھ گیا۔

نیند اور نیم بیداری کی حالت میں تقریباً آدھ گھنٹہ گزر گیا پھر وہ مہری نیند میں جانے ہی والا تھا کہ اس نے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنی۔ اس نے غنودگی کے عالم میں سوچا کہ کوئی مسافر ہو گا، اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا، آدھ گھنٹے کے اس آرام نے ہی اس کا سر درد ختم کر دیا تھا۔

تقریباً دو ہی منٹ کے بعد اس نے سرائے کے مالک اور آنے والے مسافر کی آوازیں سنی۔ وہ دونوں برآمدے میں آگئے تھے سرائے کے مالک نے مسافر سے بڑے احترام کے ساتھ پوچھا ”ہی کیا شاہجی؟“

مسافر نے کہا۔ ”بھوجن کروں گا۔ تیار کرو۔“

گل محمد نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔۔۔۔۔ یہ آواز اس کی سیکڑوں بادی کی سنی ہوئی تھی۔ وہ بغیر آواز کئے اٹھا اور دبے پاؤں کھڑکی کے پاس جا کر اس نے کھڑکی کے تقریباً بند پنوں کی دروازے سے جھانک کر دیکھا۔۔۔۔۔

اس کا خیال ٹھیک تھا۔

آنے والا مسافر رانی لکشی بانی کا ایک توپچی پانا شاہ تھا۔

”توسر کار کسی کمرے میں آرام کریں“ سر اے کا مالک پانا شاہ سے کہہ رہا تھا۔ ”آدھے گھنٹے میں بھوجن تیار ہو جائے گا“

”نہیں“ پانا شاہ نے کہا ”میں یہیں دالان میں بیٹھوں گا۔ مجھے کسی کا اختیار (انتظار) ہے۔“

”جیسی شاہجی کی مرضی“ کہہ کر سر اے کا مالک کھانے کا انتظام کرنے دوسری طرف چلا گیا۔

گل محمد کو سوچنا پڑا کہ یہ پانا شاہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ آجکل تو مہارانی صاحب کے کسی بھی سپاہی کو جھانسی کے باہر نہیں ہونا چاہیے۔۔۔۔۔ جب تک کوئی جمجوری یا کوئی اشد ضروری کام نہ ہو۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر واپس اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔ پانا شاہ یا دو لہا جو کے خلاف اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا، لیکن نہ جانے کیوں اس کی نگاہ میں ان دونوں کی وفاداری کی مشکوک تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد کوئی شخص پانا شاہ کے پاس آیا۔ پانا شاہ نے جلدی سے کہا ”سنو بلم سنگھ۔۔۔۔۔ تم فوراً کتنا ہی چلے جاؤ۔ جزل روز صاحب بہادر وہیں ٹھہرے ہوئے ہیں آج کل۔ ان کو میرا پر نام کہنا۔ سوچنا یہ ہے کہ رانی تیجی (تیزی) سے اپنی سینا بڑھاتی چلی جا رہی ہے۔ گل محمد کو اس نے راحت گڑھ بھیجا ہے۔ تمام میں مسہور (مضبور) تو یہ کیا گیا ہے کہ اس کے چاچا کی لڑکی کا بیاہ ہے۔ پر میرا خیال یہ ہے کہ گل محمد کو رانی نے راحت گڑھ سینا کھنٹی کرنے بھیجا ہے۔ امیر کھان کو گل محمد پہلے

ہی راحت گڑھ سے بلوا چکا ہے اور یہ۔۔۔۔۔ امیر کھان سینا کے سپاہیوں کو پر شکستن (تریت) دے رہا ہے۔ محل میں یہ کھمر مٹ کر رہی ہے کہ جلدی ہی راحت گڑھ اور اس کے آس پاس کے علاقوں (علاقوں) سے بہت سے لوگ آکر رانی کی سینا میں شامل ہو جائیں گے۔۔۔۔۔ گلام گوٹ کھان نے توپ کھانا پوری طرح سے ٹھیک کر لیا ہے۔ ساری ہتھارانی کے آدیش کا اقتدار کر رہی ہے۔ ابھی تو جھانسی میں شانتی ہے، پر کس دن یہ شانتی کھتم ہو جائے اور جھانسی کے گورے صاحبوں پر نوٹ پڑے، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ تم یہ ساری سوچنا میں جزل روز بہادر کو پہنچانے کے لئے ابھی کتنا ہی کے لئے چل پڑو تو پرسوں تک۔۔۔۔۔“

گل محمد نے پوری قوت سے دروازہ کھولا اور برآمدے میں نکل آیا۔

پانا شاہ اور کا سائسی بلم سنگھ چونک پڑے۔۔۔۔۔ اور پھر گل محمد پر نظر پڑے ہی پانا شاہ کا چہرہ سفید ہو گیا۔ لیکن پھر کمال کی پھرتی سے اس نے خود کو سنبھالا، جاتے ہوئے حواس کو سنبھال لیا، کیونکہ اسے جیسے کسی نبی قوت نے آگاہ کیا کہ اس وقت خوف یا کمزوری اسے لے ڈوبے گی۔

”فدا۔۔۔۔۔ ملعون“ گل محمد دہڑا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا، اور اس کی خونخوار نظریں پانا شاہ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس نے نیام سے اپنی تلوار نکال لی۔ پانا شاہ نے بلم سنگھ کو وہاں سے بھاگ جانے کا اشارہ کیا اور بلم سنگھ جان چھوڑ کر بھاگا مگر گل محمد نے بھوکے پیٹے کی طرح جست لگائی اور اسے جالیا۔

”رک جا۔۔۔۔۔ ملعون۔۔۔۔۔ ورنہ ادا شمشیر تیرے ناپاک کلیجے کے پار او جائے گا“ وہ دہڑا مگر تبھی گویا اس کی جھمی حس نے اسے آگاہ کیا کہ اس پر پشت سے حملہ کیا جا رہا ہے۔ اس نے بائیں جانب چھلانگ لگائی مگر چھلانگ لگاتے لگاتے بھی پانا شاہ کی تلوار نے اس کے دایبے بازو میں ہکا سار خنم لگا دی۔

ادھر بلم سنگھ کو بھی اپنی موت اپنے سر پہ کھڑی نظر آئی اس نے گھبرائے، کانپتے ہاتھوں سے اپنی تلوار نکال لی، حالانکہ گل محمد کے تیوروں نے اس کا

چہرہ بھی سفید کر دیا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر اسے کچھ تعقیر لگی کہ پانا شاہ بھی تلوار نکال چکا تھا، اور صرف نکال ہی نہیں چکا تھا بلکہ پشت سے حملہ کر کے گل محمد کو ایک ہلکا سا زخم بھی لگا چکا تھا۔

اب ایک طرف پانا شاہ کی تلوار تھی دوسری طرف بلم سنگھ کی۔ گل محمد چاہتا تو آج واحد میں دونوں کو ختم کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے فوری فیصلہ کیا ”اس عدار پانا شاہ کو مارانی ساب کے سامنے پیش کرنا یہ اور اس فاسق بد ذات پیغام رساں کو جزل روز کے پاس نہیں پونچنے دینا ہے“ چنانچہ اس نے زوایہ بدلا ..... پھر پانا شاہ کو پیہ ہی نہ چلا کہ کب گل محمد کی تلوار بلم سنگھ کے سینے کے پار ہو گئی۔ بلم سنگھ کی آنکھیں بدہشت اور اذیت سے جہاں تک پھیل سکتی تھیں، پھیل گئیں۔ اس نے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر زمین پر گر گئی، ایک دلخراش چیخ اس کے منہ سے نکلی اور وہ بھی زمین پر گر پڑا۔ اس کے سینے سے خون ابل رہا تھا۔

اس کے سینے سے اگلے ہوئے خون پر نظر پڑتے ہی پانا شاہ کے چہرے پر پچیلی ہوئی بدہشت میں اضافہ ہو گیا۔ گل محمد کی تلوار شاید بلم سنگھ کا دل چھیدتی ہوئی اس کے سینے سے پار ہو گئی تھی کیونکہ اسے مر نے میں چند لمحے ہی لگے۔

لیکن بلم سنگھ کے زخم، اس کے زخم سے اگلے ہوئے خون اور پھر اس کی موت کا گل محمد پر کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ اب اس کی آنکھیں مزید سرخ ہو گئیں تھیں۔ ایک لمحہ وہ اپنی خونخوار آنکھوں سے پانا شاہ کو گھورتا پھر اونچی پاٹ دار، اور پروقار آواز میں لیکن نہایت سرد لہجے میں بولا ”سن نابکار پانا شاہ..... ام مارانی ساب کا خادم خاص تجھ ملعون کو اکم دیتا..... اپنا منوس شمشیر زمین پر ڈال کر اپنے کریمہ وجود کو گرفتاری کے لئے پیش کر۔ ام رسی سے جکڑ کر تجھ سٹخ کو مارانی ساب کے حضور پیش کرے گا اور تو اپنی غلیظ زبان سے بتائے گا کہ تو کس کا واسطے کام کرتا، کس کا جاسوس ہے، جانی میں تیرا آقا کون ہے، اور اب تک تو کون کون سا راز اپنا سفید نام آقا کو پونچا چکا ہے۔..... شمشیر ڈال بد بخت“

پانا شاہ نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے گل محمد پر شمشیر کا وار کیا۔ یہ ایک ڈرے سیے شکست خوردہ اور بدزل انسان کا وار تھا جو اس نے گل محمد کو ضرر پہنچانے سے زیادہ اپنا اعتماد بحال کرنے اپنا حوصلہ بندھانے کے لئے کیا تھا۔

گل محمد نے اس کی تلوار کا وار اس زاویے سے اپنی تلوار پر روکا کہ پانا شاہ کی تلوار دو ٹکڑے ہو گئی۔ پھر گل محمد نے اپنی تلوار کی نوک پانا شاہ کے سینے پر رکھ دی۔ تلوار ٹوٹنے ہی پانا شاہ پوری طرح سے مایوس ہو گیا۔ آدمی تلوار جو اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ میں اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی۔ رحم کی التجا کرتی ہوئی نظروں سے وہ گل محمد کو دیکھنے لگا۔

گل محمد نے سرائے کے مالک سے رسی منگوائی اور اس کی مدد سے پانا شاہ کو رسی سے باندھ کر گھوڑے کی پشت پر بٹھا دیا۔ بلم سنگھ کی لاش کی طرف اشارہ کر کے سرائے کے مالک سے بولا..... ”سنو..... اس عدار کی لاش کو اس کا خاندان والوں کا سپرد کر دینا اور یوں اس کا سنی انجام واجب تا۔ مارانی ساب کا اور اس ملک کا تمام عدار کا سنی انجام واجب ہے۔“

پھر وہ اپنے گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گیا۔ پانا شاہ کے گھوڑے کی لگام اس نے اپنے ہائیں ہاتھ میں تھام رکھی تھی اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور جھانسی کی طرف روانہ ہو گیا۔

لیکن پانا شاہ کو رانی کی خدمت میں زندہ پیش کرنے کی حسرت گل محمد کے دل میں ہی رہ گئی۔

ابھی اس نے صرف دو گھنٹے کا سفر ہی طے کیا تھا کہ راستے میں ایک پہاڑی کے پیچھے سے ایک گولی چلی اور پانا شاہ کے سینے پر پڑی۔ وہ گھوڑے کی پشت سے گرا چند لمحے تڑپا اور ٹھنڈا ہو گیا۔

گل محمد نے اپنے گھوڑے کی پشت سے چلاٹک لگانے میں بڑی پھرتی دکھائی۔ بے حد جاگتے ہوئے ذہن کا انسان تھا۔ اسے علم تھا کہ پہاڑی کے پیچھے جو بھی ہے اس



”اللہ! اس نے دل، بول میں کہا“ تو سچا تعلیم ایسے۔ سب جانتا ایسے، ہر بات کا تجھے علم ایسے۔ تو جانتا کہ ام کو لدا زندگی کا کوئی خوف نہیں۔ لدا زندگی تویر امانت ایسے، تو جب چائے، لے لے، لیکن ام اس طرح زبردستی کا موت مرنائیں جاتا..... لدا کی سب کا خدمت میں، اپنا اس عزیز وطن کا خدمت میں زندگی گزار کر موت کو گلے لگاتا جاتا..... تجھ سے کچھ پوشیدہ نہیں۔“ تقریباً دو گھنٹے گزر گئے۔ وہ اس درخت کے پیچھے چھپا ہوا، پھر جب اندھیرا اچھی طرح سے بجھ گیا تو وہ لپکا۔ پاشاہ کی لاش کو اٹھا کر اس نے اس کے گھوڑے کی پشت سے باندھ دیا اور اس گھوڑے کی لگام بایں ہاتھ میں تھام کر اپنے گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر جھانسی کی طرف روانہ ہو گیا۔

1857ء میں اور چھکارا جانا بالغ تھا۔ دیوان تھے خاں بہت دن سے جھانسی پر دانت لگائے بیٹھا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جھانسی پہلے اور چھکارا کا ایک حصہ تھی، اس لئے

جھانسی پر اور چھاکا قبضہ ہونا چاہئے۔ جزل روز تھے خاں کے خیالات سے واقف تھا۔ اس نے منصوبہ بنایا کہ ننھے خاں کو رانی کے خلاف ہتھیار اٹھانے کے لئے راضی کر لیا جائے تاکہ دونوں میں جنگ ہو اور رانی کی برحق بیوی ملاقات کم ہو جائے۔  
ننھے خاں کے لئے یہ بڑے اعزاز کی بات تھی کہ ایک انگریز جزل اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ وہ تیسرے ہی دن کنائی بیچ گیا۔

جزل روز بڑی اپنائیت کے ساتھ ملا، اچھی خاطر مدارات کی اور بولا "یہ بڑے ظلم، زیادتی اور ہٹ دھرمی کی بات ہے کہ وہ عورت آپ کے راجہ کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کئے بیٹھی ہے۔ مجھے تو ابھی حال ہی میں معلوم ہوا ہے کہ جھانسی اور چھاکا ٹیکم گڑھ کا ایک حصہ تھی، جس پر راجہ گنگا دھر راؤ کے پرکھوں نے قبضہ کر کے اپنی عمل داری قائم کر لی تھی اور اب وہ عورت اس پر قابض ہے۔ کمپنی جو پانچ ہزار روپیہ مہینہ پنشن رانی کو دے رہی ہے وہ دراصل اور چھاکا کو ملنی چاہئے۔ اب ایسٹ انڈیا کمپنی اس وقت تک وہ پنشن بند بھی نہیں کر سکتی جب تک جھانسی پر اس عورت کی عمل داری قائم ہے۔ کمپنی اپنے قول و قرار سے بندھی ہوئی ہے مگر خاں صاحب سوال کمپنی کا نہیں ہے۔ سوال ہے اس عورت کے جھانسی پر ناجائز قبضے کا..... یہ تا انصافی تو خیر ہے ہی، آپ جیسے نجیب الطرفین پٹھان کی کھلی ہوئی توجہ بھی ہے۔ مجھے تو حیرت اس بات پر ہے کہ آپ برداشت کیسے کئے بیٹھے ہیں۔ پٹھان تو بڑے غیور ہوتے ہیں۔ ایک عورت کی زیادتی اور ایک پٹھان خاموشی سے برداشت کرے! تو یہ تو بہ! نہ کبھی دیکھا نہ سنا۔"

ننھے خاں نے اپنی دشواریوں کا ذکر کیا۔ جزل روز تو یہ سننے کے لئے تیار ہی بیٹھا تھا۔ اس نے بنا ٹوٹی شرط رکھے ہر طرح سے ننھے خاں کی مدد کرنے کا وعدہ کر لیا۔  
اور ننھے خاں اپنی فوج لے کر جھانسی پر چڑھ آیا۔ رانی خود جنگی پوشاک زیب تن کر کے گھوڑے پر بیٹھ مٹی اور اور چھادر واڑے کی مکان سنہال لی۔ کرنل زماں خاں نے بائیں جانب سے اور دیوان رگھوناتھ سنگھ نے بائیں جانب سے ننھے خاں کی فوج

پر دباؤ ڈالنا شروع کیا اور غلام غوث خاں کو معلوم تھا کہ اسے کہاں، کب، کیا اور کس طرح کرنا ہے۔ اور چھادر واڑے کے برج پر اس نے گیارہ توپیں رکھوائی تھیں جنہیں وہ تنہا ہی کنٹرول کر رہا تھا۔ باقی توپیں کو اس نے دوسرے مورچوں پر بھیج دیا تھا جہاں خطرہ نسبتاً کم تھا اور کام نسبتاً آسان تھا۔ اس کے ہاتھ طوفانی رفتار سے چل رہے تھے۔ جب تک اس کی آخری توپ گولہ اگھتی تب تک پہلی توپ آگ برسانے کو تیار ہو جاتی۔ پھر اچانک غلام غوث خاں کا توپخانہ خاموش ہو گیا۔ ننھے خاں سمجھا کہ اس نے رانی کا توپخانہ تباہ کر دیا۔ وہ اپنا توپخانہ لے کر آگے بڑھا اور اونچائی پر آگیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس کی کوئی توپ گولہ برساتی، غلام غوث خاں نے اپنی توپوں سے ان پر قیامت توڑ دی۔ اور چھاکا کبھی توپیں غلام غوث خاں کی توپوں کے نشانے پر آگئی تھیں۔

دو منٹ میں ہی ننھے خاں کا توپخانہ تہس نہس ہو گیا۔ تب ادھر رانی کی گھوڑ سوار فوج نے، جو اب تک خاموش کھڑی تھی، بڑھ بڑھ کر ننھے خاں کی فوج پر حملے شروع کئے۔ رانی خود قیادت کر رہی تھی..... سندر، مندر، کاشی بانی اور گل محمد دائیں بائیں اور آگے پیچھے تھے۔ ادھر سے زماں خاں اور رگھوناتھ نے بھی دباؤ بڑھایا۔ چند منٹوں میں ہی ننھے خاں کی فوج کے پیر اکھڑ گئے۔ اپنی تباہ شدہ توپوں، اپنے ہلاک شدہ اور زخمی فوجیوں کو چھوڑ کر ننھے خاں کی فوج کو میدان جنگ چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ خود ننھے خاں بڑی مشکل سے اپنی جان بچا سکا۔

رانی کی فوج نے ننھے خاں کی بھاگتی ہوئی فوج کا تعاقب صرف اس مقام تک کیا جہاں جھانسی کی سرحد ختم ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس نے اپنی فوج کو ٹھہرنے کا حکم دیا۔ جب ننھے خاں کی فوج کے تمام سپاہی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو اس نے اپنی فوج کو واپس کا حکم دیا۔

اپس آکر میدان کارزار سے اس نے اور چھاکا کے تمام مجرد فوجیوں کو اغویا، ان کی مرہم پٹی کروائی اور انھیں قید کرنے یا کوئی اور سزا دینے کے بجائے

اور چھا بھجوا دیا اس کے بعد لاشوں کو بھی اٹھا کر اس نے بڑے احترام کے ساتھ اور چھا بھجوا دیا۔

جزل روز کو تھتھے خاں کی فتح یا شکست سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس نے ہر طرح سے تھتھے خاں کی مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اس نے اس کی کوئی مدد نہیں کی۔ اسے مدد کرنی بھی نہیں تھی وہ تو دو ہندوستانیوں کے مابین دشمنی کو فروغ دینا چاہتا تھا تاکہ کل وقت پڑنے پر وہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر انگریزوں کے خلاف صف آراء ہو جائیں۔ دوسرا مقصد جھانسی کو کمزور کرنا تھا۔

اور پھر حالات جزل روز کی موافقت میں سازگار ہوتے چلے گئے۔ دلی پر انگریزوں کا مکمل اقتدار قائم ہو گیا تھا دلی کی بغاوت بڑی سختی اور بے رحمی سے دبا دی گئی تھی۔ انگریز فوج کا ایک بہت بڑا حصہ دلی سے کنائی پہنچ گیا اور جزل روز اپنی فوج لے کر بیس مارچ 1858 کی صبح جھانسی کے جنوب مشرق میں کاماس دیوی کے مقام پر جھانسی سے تیس میل کے فاصلے پر آگیا۔

23 مارچ کو اس نے اپنی فوج کو جھانسی پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔

## ستر ہواں باب

سون رکھانالے کے کنارے لیٹے لیٹے رانی کشمی بائی ایک پورا زمانہ پھر سے جیتی رہی..... ایک پوری تاریخ اس کا ذہن دوہراتا رہا۔

واقعات کتنی تیزی سے رونما ہوتے چلے گئے تھے۔ اسے وہ رات یاد آئی جب کنور گل محمد پانا شاہ کی لاش لے کر جھانسی آیا تھا۔ جس طرح ایک دن محل میں کسی نے ملازمہ دلاری کو زبان کھولنے سے پہلے گولی مار دیا تھا اسی طرح اس دن کالو پور سے جھانسی کے راستے میں کسی نے گولی مار کر پانا شاہ کو ہمیشہ کے لئے..... خاموش کر دیا تھا۔ اسے یاد آیا کہ گل محمد نے پانا شاہ اور دو دلہا جو کی طرف شک کی ایک ہلکی سی انگلی اٹھائی تھی، مگر پھر ان دونوں میں سے کسی کے بھی خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔ ایک بار بہرام لدین نے بتایا تھا کہ اس نے اسکیں کے خاناں کو دو دلہا جو سے باتیں کرتے دیکھا تھا..... اس نے (رانی نے) موتی اور جوہی کو دو دلہا جو کے پیچھے لگا دیا تھا، مگر کوئی ثبوت نہیں مل سکا تھا..... پھر کبھی دو دلہا جو کو قلعے سے باہر جاتے نہیں دیکھا گیا، نہ ہی کبھی کوئی باہر کا آدمی اس سے ملنے قلعے میں آیا۔ صرف بہرام الدین کی فراہم کردہ اطلاع یا گل محمد کے شک کی بنیاد پر نہ تو وہ دو دلہا جو کے خلاف کوئی کارروائی کر سکتی تھی نہ اس سے کوئی پوچھ گچھ کر سکتی تھی۔

رانی کو یاد آیا کہ گل محمد نے دوسرے ہی دن راحت گڑھ سندیسہ بھجوا دیا تھا، اور پندرہ دن کے اندر راند ر راحت گڑھ اور راحت گڑھ کے ارد گرد چودہ کوس کے اندر آنے والے سارے گاؤں سے چار سو ننانوے پٹھان آکر رانی کی فوج میں بھرتی

ہو گئے تھے۔ یہ سب محبت وطن تھے، ان کے دلوں پر رانی کی حکومت تھی، جو رانی کے ایک اشارے پر اپنی زندگی داؤں پر لگانے کو تیار تھے۔ بڑی بڑی اداس سی آنکھوں، چوڑی پیشانیوں، اونچی ناکوں اور سرخ سپید رنگت کے وہ لال کرتی پٹھان گل محمدی ایک آواز پر آکر رانی کی فوج میں شامل ہوئے تھے۔ گل محمد نے رانی سے کہا تھا ”مادانی ساب، یہ سب لڑنا جانتا، مرنے جانتا، شکایت کرتا نہیں جانتا، پیچہ اٹھائیں جانتا، پشت دکھانا نہیں جانتا، یہ سب آپ کا وفادار ہے۔“

”اس نے (رانی نے) فرط جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے ہونٹ بھیجے لئے تھے آکھیں بند کر لیں تھیں۔“

اسے یاد آیا کہ وہ سارے پٹھان فوجی بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے ایک ایک کر کے شہید ہوتے چلے گئے تھے۔۔۔۔۔ صرف گل محمد رہ گیا تھا۔ اس کا اپنا کنور گل محمد۔۔۔۔۔ اور آج وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اپنی آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو بڑی مشکل سے رانی نے آنکھوں میں ہی روکا اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر سوچنے لگی۔ ”اچھا ہی ہوا جو کنور گل محمد چلے گئے۔ کوئی کہاں تک جھیلے، کہاں تک سہن کرے!۔۔۔۔۔ سہن کرنے کی ایک سیما ہوتی ہے۔۔۔۔۔ کشت سے کشت ہے ہیں ان و یروں نے! بیگوان، اب اسے کوئی کشت نہ ملے۔۔۔۔۔ کنور گل محمد۔۔۔۔۔ اس کے کشت بھی میری جیون جھولی میں ڈال دینا۔“

اسے رسالے دار کالے خاں یاد آیا، غیور، بہادر، محبت وطن، وفادار کالے خاں جو ہندوستانوں کے خلاف استعمال کئے جانے والے ہنک آمیز الفاظ برداشت نہ کر سکا تھا۔۔۔۔۔ جو انگریزوں کے لئے خوف بن گیا تھا۔۔۔۔۔ اسے ساگر سنگھ یاد آیا۔ جو ایک خونخوار ڈاکو تھا، جس کی بہادری اور بے جگری دور دور تک ایک نام تھی۔ جسے رانی کا معتمد خدا بخش تک گرفتار نہیں کر سکا تھا اور خدا بخش کے زخمی ہونے کے بعد جسے رانی نے خود جنگل میں گرفتار کیا تھا۔ لیکن پھر اس نے ساگر سنگھ کو سزا نہیں دی تھی۔ بلکہ اپنی فوج میں بھرتی کر لیا تھا، اپنا ساتھی بنا لیا تھا۔ اور ایک دن ساگر سنگھ نے

رانی کی مہربانی کا قرض اپنی جان دے کر چکا تھا۔

صحابی کو وہ دن یاد آیا (چھ جنوری ۱۸۵۸ء) جب اس کی جاسوس موتی بانی خبر لائی تھی کہ جنرل روز (Rose) جھانسی کو فتح کرنے اور رانی کی سرکوبی کے لئے بہت بڑی فوج لے کر جھانسی کی طرف چل پڑا ہے۔ یہ خبر سن کر اس نے (رانی نے) جھانسی کے چاروں طرف دور دور تک کے تمام گاؤں خالی کر لئے تھے تاکہ انگریزوں کو کسی طرح کی کوئی مدد نہ مل سکے۔ راستے میں پڑنے والے کھیتوں کو اجاڑ دیا گیا تھا، درخت گردائے گئے تھے۔ لیکن مہاراجہ سندھیانے انگریزی فوج کے لئے رسد اور گھوڑوں کے لئے چارامہیا کر دیا تھا اور تمام آسانیاں فراہم کر دی تھیں۔ رانی کو یاد آیا کہ جنرل روز کی فوج بنا کسی دشواری کے جھانسی کے نزدیک آگئی تھی، اور اس نے (23 مارچ ۱۸۵۸ء) جھانسی پر حملہ کر دیا تھا۔ رانی کو یاد آیا کہ کس بہادری سے اس کی فوج نے جنرل روز کی فوج کا مقابلہ کیا تھا اور کس طرح اس کے توپچیوں نے انگریزوں کے دانت کھٹے کئے تھے۔ اسے غلام غوث خاں۔۔۔۔۔ کنور غلام غوث خاں۔۔۔۔۔ یاد آیا اور وہ سوچنے لگی کہ ”جھانسی کا اتہاس گلام گوٹ کھان کے جگر (ذکر) کے بنادھور ہے گا۔“۔۔۔۔۔ غلام غوث خاں کو دیکھ کر رانی کے من میں صرف ایک ہی خیال ہمیشہ آیا تھا۔۔۔۔۔ ”بڑی بڑی چڑھی ہوئی بھوری سی گھٹی مونجھوں، بھرے بھرے گلابی گالوں، لمبی اونچی ناک، بڑی بڑی کچھ بھوری سے آنکھوں، چٹان سے سینے اور چھ ہاتھ لمبے اور فولادی جسم والا یہ پرانی بیگوان نے منٹس بنایا ہے یا ایماندار، بہادری اور سوائی بھکتی کے آکھری دیوتا کی رچنا کر کے اسے دھرتی پر بھیج دیا ہے!“۔۔۔۔۔ غلام غوث خاں پر نظر پڑتے ہی ہمیشہ رانی کے دل میں خیال آیا تھا ”وہ دھرتی کھنڈ دھنیہ ہے جس پر کسی گلام گوٹ کھان نے جنم لیا ہے۔“ آج بھی سون رکھنا لے کے کنارے مولسری کے اس گھٹے درخت کے نیچے لیٹے ہوئے رانی کو جب اپنا وہ جاں نثار ساتھی یاد آیا تو اس کے دل میں خیال آیا۔ ”دھنیہ ہے وہ دھرتی کھنڈ جس پر کسی گلام گوٹ کھان نے۔۔۔۔۔ یا کسی گل محمد نے جنم لیا ہے۔۔۔۔۔ پر یہ کنور

گل محمد چلا کہاں گیا؟..... اور گیا تو کچھ کہہ کر کیوں نہیں گیا؟..... اگر وہ جانے کی بات کر تا تو میں کھدا سے وداع دیتی..... آشیر وادے کر..... آشیر وادے کے سوا اب میرے پاس کسی کو دینے کے لئے بچا ہی کیا ہے!.....

جنگ پھر خود کو دوہرا لے گئی رانی کے من میں..... اسے یاد آیا کہ تیسرے دن ساگر سنگھ انگریزوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گیا تھا..... اور دل ہی دل میں رانی نے اپنے اس جیلے جاں نثار کی آتما کی شافی کے لئے پرا رتھنا کی تھی۔

آٹھ دن تک جنگ جاری رہی تھی۔ پھر غدار دولہا جو نے قلعے کا ایک پھانک کھول دیا تھا اور انگریزوں فوج قلعے میں در آئی تھی۔ سند رانی نے..... دولہا کو قلعے کا پھانک کھولتے ہوئے دیکھا تھا اور ننگی تلوار لے کر وہ دولہا جو پر جھپٹی تھی اور چلائی تھی ”پاپی ٹھاکر، بدیش دروہی کتے۔ تو بھی مر۔“ مگر اس کی تلوار کا وار دولہا جو نے لوسے کی چمڑ پر روک لیا تھا، اس کی تلوار دو ٹکڑے ہو گئی تھی۔ وہ ٹوٹی تلوار سے ہی جنگ کرنے لگی اور پھر اسی جگہ انگریزوں سے جنگ کرتے کرتے جھانسی کی وہ بہادر بیٹی شہید ہوئی تھی۔

پھانک کھلنے اور سند رانی کے شہید ہونے کی خبر ملتے ہی رانی کو اپنا وہ توپچی بہرام الدین یاد آیا جس نے اسے دولہا جو سے ہو شیار بننے کو کہا تھا اور پھر صاف بتا دیا تھا کہ دولہا جو انگریزوں کا وفادار اور جھانسی کا غدار ہے، لیکن رانی نے اس کی بات نہیں مانی تھی اور دولہا جو کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ بہرام الدین اتنا دل براشتہ ہو گیا تھا کہ اس نے رانی کی ملازمت سے استعفا دے دیا تھا، اور غصے میں رانی نے اس کا استعفا منظور بھی کر لیا تھا۔ اور اب دولہا جو کی غداری سامنے آگئی تھی۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ دولہا جو نے جھانسی کے قلعے کا ایک پھانک نہیں کھولا تھا۔ جھانسی کی تاریخ کو غلط کر دیا تھا۔ رانی کو یاد آیا کہ مجبور ہو کر اسے دست بہ دست جنگ کرنے کا فرمان جاری کرنا پڑا تھا۔ اور پھر رانی کو یاد آیا کہ سب سے پہلے اسے لانا برہمن کی شہادت کی خبر ملی تھی۔ آخر تک وہ اپنے افسر غلام غوث خاں

کے کندھے سے کندھا لاکر جنگ کر تا رہا۔ رانی ابھی لانا برہمن کی موت کا صدمہ برداشت کر رہی رہی تھی کہ اسے ایک اور بہت بڑی خبر ملی۔ کنور خدا بخش شہید ہو گیا تھا۔ ”بھگوان!“ رانی نے دانت بھینچ لئے۔ اس کی نگاہ موتی پانی پر پڑی۔ اسے موتی پانی اور خدا بخش کی محبت کا علم تھا۔ موتی کا چہرہ پتھر کا ہو گیا تھا، موتی جیسے خود پتھر اُچی تھی۔ اس کے منہ سے نکلا ”ان اللہ وانا الیہ راجعون“۔ رانی نے کہا تھا ”موتی میں تیری آنکھوں میں آنسو نہ دیکھوں“ اور موتی نے کہا تھا ”نہیں دیکھیں گی مہارانی صاحب۔“ رانی نے خدا بخش کی قبر تیار کرنے کا حکم جاری کیا۔

ابھی کنور خدا بخش کی قبر تیار بھی نہ ہو پائی تھی کہ ایک اور لاش رانی کے سامنے لائی گئی۔ کنور غلام غوث خاں کی لاش۔

اسی وقت محل کے باہر کچھ شور سنائی دیا تھا۔ رانی نے موتی سے کہا تھا۔ زرا دیکھنا موتی۔“ اور موتی اپنی تلوار لے کر فسیل کی طرف چلی گئی تھی۔

اور رانی کو یاد آیا کہ جب موتی پانی کی لاش اس کے سامنے لائی گئی تو اس کے منہ سے بے ارادہ نکلا تھا۔ ”میری موتی۔ آج تو بہر ا ہو گئی۔“

رانی کو یاد آیا کہ تینوں قبریں گل محمد کی دیکھ کر رکھ میں تیار ہوئی تھیں اور کنور خدا بخش کنور غلام غوث خاں اور شہید موتی پانی کو سپرد خاک کیا گیا تھا۔

اسے یاد آیا کہ ابھی وہ ان قبروں کے پاس سے ہئی ہی تھی کہ مندر تیزی سے اس کی طرف آئی تھی اور اس سے قبل کہ مندر کچھ کہتی اس نے مندر سے کہا تھا، ”جا کر بھاء بخش پاپور سنگھ کو اور چھا پھانک پر بھیجو۔ وہاں کا مورچہ سنبھال لے ہوئے کرل جہاں کھان (زماں خان) کو چو میں گھسنے سے جیادہ کاہنے ہو گیا ہے۔ تھک گئے ہوں گے“ مندر رو پڑی تھی۔ بڑی مشکل سے وہ کہہ پائی تھی ”مہارانی جی..... اور چھا پھانک پر انگریزوں کا ادھیکار ہو چکا ہے“ رانی نے بڑے تعجب سے کہا تھا۔ ”کرل جہاں کھان کے ہوتے!!“ اور آنسوؤں کے درمیان مندر نے اسے اطلاع دی تھی۔ کرل جہاں کھان چرندرا (ابدی نیند) میں سو گئے۔ مگر انھوں نے

انگریزوں کی گولیوں کو پیٹھ پر نہیں، سینے پر جمیلا ہے۔“

”کنور گل محمد“ رانی نے گل محمد کو مخاطب کیا تھا۔ ”کنور کھدا ایکش کے شہید ہونے کی کھمر سن کر ہماری موتی کچھ عربی بولی تھی۔ وہ تمہیں آتی ہے؟“ ”جی..... ہاں اللہ واپا! یہ راجحون“ گل محمد نے کہا تھا۔

”انا.....“ رانی نے کہنے کی کوشش کی تھی۔ اور بڑی مشکل سے اس نے کہا تھا ”انا..... اللہ واپا! یہ راجحون۔“ پھر اس نے گل محمد سے پوچھا تھا ”اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟“

اور گل محمد نے کہا تھا ”ہم اللہ کے ہی ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔“

”ایک اور قبر تیار کرو اور کھدا اور گل محمد جہاں کھان کی لاش منگواؤ۔“ رانی نے گل محمد سے کہا تھا اور خود کسی مورچے پر جانے کے ارادے سے کھڑی ہو گئی تھی۔

اپنے ساتھیوں کی یاد آتے ہی فولا دی رانی کی آنکھوں کے کونوں سے دو آنسو نکل کر اس کی ڈکھتی ہوئی کنپٹیوں پر دور تک گیلی کیریں ڈالتے چلے گئے۔ اسے یاد آیا کہ وہ خود اور چھا پھانک کی جانب جانے کے لئے کھڑی ہوئی تھی اسی وقت بزرگ ناتا بھوجپکر نے اسے صلاح دی تھی ”آپ پیچھے ہٹ کر قلعے میں لوٹ چلئے۔ آپ کے بارے جانے سے سوتتر تا عکرام (جنگ آزادی) کو ہر اکادھر ارہ جائے گا۔“ اس نے (رانی نے) گل محمد کی طرف دیکھا تھا اور گل محمد نے کہا تھا ”ناتا خان یک (ٹھیک) بوتا مہارانی ساب۔ آپ کا حیات ضروری ہے۔ امداد واسطے، جانی (جھانی) کا واسطے، سر زمین کا واسطے، اس پورا ملک کا واسطے۔ سب کا واسطے۔“ اسی وقت بھاء بخشی اسیا تھا۔ اُس نے، رگھوناتھ سنگھ نے، مندر نے اور جونی نے..... سبھی نے ناتا بھوجپکر اور کنور گل محمد کی تائید کی تھی اور وہ (رانی) مان گئی تھی، اور قلعے میں واپس آگئی تھی۔ اس نے اپنے تمام ساتھیوں کو جمع کیا تھا اور ان پر نظر ڈالی تھی۔ بھاء بخشی اور رگھوناتھ سنگھ کے علاوہ ایک بھی بند یا باقی نہیں بچا تھا۔ نہ سردار، نہ سپاہی، چار سو

نانوے لال کرتی پھانوں میں سے بھی نصف سے زیادہ شہید ہو چکے تھے۔

رانی کو یاد آیا کہ کس طرح انگریز فوج شہر میں داخل ہوئی تھی، کس طرح پانچ برس کے بچوں سے لے کر اسی سال تک کے بوڑھوں کو انگریزوں نے موت کے گھاٹ اتارا تھا، کس طرح عورتوں نے کنوؤں میں کود کود کر اپنے سنی دھرم کی رکشا کی تھی، کس طرح انگریزوں نے شہر کو نذر آتش کیا تھا، کس طرح راج محل اور کتب خانے کو جلا کر رکھ دیا تھا۔ جھانی کی تمام پردرد تپانی کا نظارہ رانی لکشی بائی نے اپنی آنکھوں سے کیا تھا۔ شام ہوتے ہوتے اس کے تمام ساتھیوں نے اسے جھانی چھوڑ کر کالپی چلے کا مشورہ دیا تھا۔ رانی راضی ہو گئی تھی۔ جھانی میں بچائی کیا تھا، فتح کا تصور تک دم توڑ چکا تھا۔ رانی نے اپنے تمام بچے کچھ ساتھیوں کے ساتھ جھانی کو زیر باد کہہ دیا تھا۔ لیکن ابھی وہ لوگ شہر سے پوری طرح باہر بھی نہ ہو سکے تھے کہ انگریزی فوج کی ایک پلٹن نے انھیں گھیر لیا تھا۔ بھیاک جنگ ہوئی تھی۔ دھندلے میں لڑی جانے والی اس جنگ میں بھاء بخشی اور اس کے ساتھ بہت سے لال کرتی پھان شہید ہوئے تھے۔ صبح لفظیت واکر نے اپنے گھوڑ سوار فوجی دستے کے ساتھ ان پر پیچھے سے حملہ کیا تھا۔ اور رانی نے گل محمد کو پہلی بار طیش میں آکر لاتے دیکھا تھا۔ ایک لمحہ تو رانی کو ایسا لگا تھا جیسے ان کا یہ پھان سپاہی پاگل ہو گیا ہو۔ اس کے منہ سے بھم بھم الفاظ نکل رہے تھے۔ رانی کی طرح ہی اس نے گھوڑے کی لگام چھوڑ رکھی تھی، صرف رکاب میں غیر پھنسائے ہوئے تھے اس کے دونوں ہاتھوں میں تلواریں تھیں جو انگریزوں کے لبو سے سرخ اور مزید سرخ ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کے داہنے ہاتھ کی تلوار کا ایک وار لفظیت واکر کی داہنی ران پر پڑا تھا۔ واکر ہلکا کر پیچھے ہٹا تھا۔ اور پھر رانی کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر وہ میدان سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے فوجی دستے کے پاؤں اکھڑ گئے تھے۔ اس جنگ میں رانی کا گھوڑا بھی زخمی ہو گیا تھا لیکن اس بہادر اور وفادار گھوڑے نے اپنی مالکن کو ایک سو دو میل دور کالپی پہنچا کر ہی دم توڑا تھا۔ اس کی موت بھی رانی کے لئے اتنا ہی بڑا درد تھی جتنا بڑا درد اس کے

کسی انسان ساتھی کی موت تھی۔ جھانسی سے نکلنے کے وقت جس آخری آدمی کو اس نے شہید ہوتے دیکھا تھا وہ بہرام الدین تھا۔

کالپی میں اسے تاتیانوپے، باندہ کے نواب اور باناپور کے راجہ ملے تھے۔ سب نے سر جوڑ کر مشورہ کیا تھا، لیکن اس سے قبل کہ وہ کسی نتیجے پر پہنچ سکتے، انگریز فوج آگئی تھی۔ جنرل روز رانی کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ وہ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ رانی لکشی بائی کے ختم ہوتے ہی یہ بغاوت ختم ہو جائے گی جسے کچھ ہندوستانی ”جنگ آزادی“ کہتے ہیں کچھ ”سوتنتر تانگرا“ مطلب دونوں کا ایک ہی ہے۔ اس لئے رانی لکشی بائی کا صفحہ ہستی سے مناسوری ہے۔ رانی صرف ایک فرد یا دلوں پر حکمرانی کرنے والی ایک فرمانروا ہی نہیں تھی وہ اب بھی اس غریب الوطنی میں بھی ہندوستانیوں کی امید تھی۔ اس لئے جنرل روز نے اس کی موت کو اپنی زندگی کا واحد مقصد بنا کر رکھا تھا۔ ایک بار پھر جنرل روز اور رانی آئے سانسے تھے۔ جنگ شروع ہوئی۔ اور تقریباً فوراً ہی رانی کو علم ہو گیا کہ اس کے ارد گرد صرف کالپی کے چند بندیلے اور اس کے بچے کچھ پنجان ساتھی ہی ہیں تاتیانوپے بھی موجود تھا، لیکن باندہ کے نواب اور باناپور کے راجہ فرار ہو چکے تھے۔ تاتیانوپے کی صلاح پر رانی کو پیچھے ہٹنا پڑا تھا۔ اور وہ لوگ کالپی میں بھی فتح کی امید چھوڑ کر گوالیار کی طرف چلے گئے تھے کیونکہ گوالیار کا قلعہ نہ صرف بے حد مضبوط تھا بلکہ بے حد محفوظ بھی تھا۔ مگر وہاں ایک اور جھک رانی کا انتظار کر رہا تھا۔ رانی کو یاد آیا کہ گوالیار کے مہاراجہ جیانی راؤ سندھیا نے اس کی مدد کرنے کے بجائے اس پر حملہ کر دیا تھا (کم جون 1858)۔ تاتیانوپے نے بڑی ہوشیاری سے کام لے کر مہاراجہ کی فوج کو اس کی (رانی کی) طرف کر لیا تھا۔ یہ دیکھ کر مہاراجہ آگرہ کی طرف بھاگ گئے تھے۔ تیسرے دن (تین جون 1858) پھول باغ میں دربار ہوا تھا، راؤ صاحب کو پیشوا مان لیا گیا تھا، توپوں سے سلامی داغی گئی تھی اور پھر اس کے (رانی کے) منہ کرنے کے باوجود بھنگ چھانی گئی تھی اور موج مستی کا دور شروع ہو گیا تھا۔ تیرہ دن کے

بعد (سولہ جون 1858) کو جنرل روز، بریگیڈر اسمتھ اور بریگیڈر اسٹوارٹ بہت بڑی فوج کے ساتھ آچینپے۔ دو گھنٹے میں انھوں نے راؤ صاحب کی فوج کو جس جھنڈے کے دیا اور مرار پر قبضہ کر لیا۔ تب تاتیانوپے اور راؤ صاحب اس کے پاس (رانی کے پاس) آتے تھے اور اس نے کہا تھا ”کیا جنگ ختم ہو گئی؟“.....

اور شرمندہ تاتیانے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا ”مہارانی جی، اب ان باتوں کا سنے نہیں رہ گیا ہے۔ مرار پر انگریزوں کا اھیکار ہو گیا ہے، ہماری بھولوں کو شاکریں اور ہمیں آدیش دیں کہ ہم کیا کریں۔“

اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے، جنھیں اس نے جلدی سے پونچھ ڈالا تھا اور کہا تھا ”تیاری کا سنے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ اب دھیرہ کے ساتھ کام لو۔ یہاں سے نکل کر مہاراشٹر جانا ہاں سینا اکٹھا کرنا اور شتر دے لو ہالینا۔ میرا تو شاید یہ آکھری یدھ ہو گا۔“

اگلے دن (17 جون 1858) جنگ شروع ہوئی تھی۔ رانی کی فوج نے جس میں اب صرف لال کرتی پنجان رہ گئے تھے، انگریزوں کا بہت نقصان کیا تھا۔ دوسرے دن جنرل روز خود رانی سے مقابلے کے لئے میدان میں آیا تھا۔ اپنے گود لئے بیٹے دامودر کو گھومتا تھا کچھ کو سوچتے ہوئے اس نے (رانی نے) کہا تھا ”اب اس کی جتنے داری تمھاری ہے..... اور گل محمد سے کہا تھا.....“ میرے شریہ کو دشمن نہ چھوٹنے پائے۔“

اور گل محمد نے دانت پر دانت جھاکر اور شعلہ بارنگا ہوں سے انگریزی فوج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ”ایسا ہی ہو گا مہارانی سب۔“ اور وہ گل محمد چلا گیا!!

رانی کو یاد آ..... ابھی کل..... ہاں کل ہی کی تو بات ہے۔ بڑی بھیاں جنگ ہوئی تھی۔ گل محمد اور اس کے ساتھی ایک بار پھر جنوں کے ساتھ لڑے تھے۔ اور ایک ایک کے کے گرے چلے گئے تھے، ختم ہوتے چلے گئے تھے۔ کسی نے پیٹھ نہیں دکھائی تھی۔ انت سنے تک یدھ کیا تھا ان لال کرتی پنجانوں نے گرے اور مرتے

مرے ان کے منہ سے عربی کے وہ شدید نکتے جو ہر مسلمان مرتے سنے کہتا ہے۔ جسے یہ لوگ کلمہ کہتے ہیں۔ اسے جو ہی یاد آئی جو موتی کی طرح ہی ایک نرنگی (طوائف) کی بیٹی تھی جو گاتی تھی، نرئیہ کرتی تھی، رنگ شالہ میں..... موتی کی طرح ہی ناکوں میں کام کرتی تھی۔ پھر جو میرا کہتے ہیں، مجھ سے ملنے کے لئے اس کے پاس قلعے میں آنے لگتی تھی، جسے سندھ، مندر، کاشی بائی اور موتی کی طرح ہی اس نے (رانی نے) تلوار چلانا، بندوق چلانا، گھوڑ سواری کرنا اور کشتی لڑنا سکھایا تھا۔ پھر جو اس کی جاسوس بن گئی تھی اور آخر میں اس کی محافظ۔ کل تک وہ بھی ساتھ رہی تھی۔ پھر ساتھ چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ انگریزوں سے جنگ کرتے کرتے شہید ہو گئی تھی اور تب بچے کچھ پٹھان ساتھیوں اور خود اس نے (رانی نے) ایسی جنگ کی تھی کہ انگریزوں کو میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا۔

پٹھان فوجیوں نے اپنے ساتھیوں اور جو ہی کی قبریں تیار کی تھیں۔ سب سے عمر رسیدہ فوجی نے نماز پڑھائی تھی اور دیش بھکتوں کو دیش کی مٹی کے حوالے کر دیا تھا جو ہی کی یاد آتے ہی پھر رانی کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور اس نے دل ہی دل میں دعا مانگی تھی۔ ”یہ جو ہی کے اللہ..... میری جو ہی کو جنت میں جگہ دینا۔“

پہلی کبھی فوج تاتیا کی فوج سے جا ملنے کی غرض سے مغرب کی جانب روانہ ہو گئی تھی۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد انگریزوں کی فوج کے ایک دستے نے انھیں گھیر لیا تھا۔ اس کے (رانی کے) بھوکے پیاسے اور تھکے ماندے ساتھیوں نے ایک بار پھر دشمن کے دانت کھٹے کھٹے کر دئے تھے اور انھیں بھاگنا پڑا تھا۔

رات میں سون ریکھنا لے کے کنارے قیام کیا گیا تھا۔ اور صبح جب وہ لوگ سو کر اٹھے تھے تو گل محمد غائب تھا۔

دوپہر ہونے کو آئی۔ رانی خود بہت بھوک تھی، مگر اپنی بھوک سے زیادہ اسے اس امر کا احساس تھا کہ اس کے ساتھی بھوکے ہیں۔ لیکن وہ یہاں پر بیٹھی بھی تو نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور جیسی اس نے آوازیں سنیں۔ گھوم کر دیکھا۔ گل

محمد آ رہا تھا اس کے چہرے پر حشکن اور پشت پر ایک بڑی سی گھڑی تھی۔ گھڑی رانی کے سامنے رکھ کر وہ پیچھے ہٹا اور رانی کو فرشی سلام کیا۔

گھڑی میں تقریباً بیس سرکے اور کچے آم تھے اور رخصت ہوتی ہوئی فصل کے خربوزے۔ رانی نے ایک گہری نظر گل محمد پر ڈالی، اور پھر آنسو آنکھوں سے نکل کر اس کے گالوں پر بہہ چلے۔

سب نے آم اور خربوزے کھائے اور نالہ پار کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ رانی کا گھوڑا اڑ گیا اور باوجود انتہائی کوشش کے اس نے نالہ پار نہیں کیا۔ آگے ہی ٹھہر پڑا۔ اسی وقت وہاں چندہ انگریزوں کا ایک فوجی دستہ آگیا۔ یہ دستہ بھی جہل روز کی فوج کے ان دستوں میں سے ایک تھا جو رانی کی تلاش میں چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ رانی سمیت اب ادھر صرف سات افراد رہ گئے تھے، ان میں سے بھی ایک سات سالہ دامودر تھا جو صرف تماشا ہی تھا۔

ایک بار پھر جنگ شروع ہوئی۔ رانی نے اپنی آخری سبیلی مندر بائی کو شہید ہوتے دیکھا۔ ابھی وہ مرتی ہوئی مندر پر سے لٹکائیں ہٹا بھی نہ پائی تھی کہ ایک انگریز فوجی نے گولی چلا دی جو رانی کی ران میں لگی۔ رانی کی منہ سے چیخ نہیں نکلی لیکن ران کے زخم سے خون ابل پڑا۔

ایسا لگتا جیسے اس زخم کی سرخ چیخ گل محمد نے سنی۔ وہ طوفان کی طرح رانی کی مدد کے لئے چھٹا۔ لیکن اسی وقت ایک دوسرے انگریز فوجی نے اپنی وزنی اور چوڑے پھل والی تلوار سے رانی کے سر پہ وار کیا۔ رانی کے سر کا بلیاں حصہ مع بائیں آنکھ کے کٹ کر زمین پر گر پڑا۔ اس کے باوجود رانی اپنے گھوڑے کی پشت پر جمی رہی اور اس نے اپنی تلوار سے اس انگریز کے کندھے پر وار کیا۔ اس کا کندھا کٹ گیا۔ تب تک گل محمد وہاں پہنچ گیا۔ اور اس نے انگریز فوجیوں کو اپنی تلوار پر رکھ لیا۔ نو انگریز مارے گئے۔ چھ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

اب وہاں صرف لاشیں رہ گئیں، رانی کشمی بائی رہ گئی، دامودر رہ گیا، رام



چندر دیش کھ رہا، رگھو ناتھ سنگھ رہ گیا۔ اور کنور گل محمد رہ گیا۔

ان سب نے رائی کو ایک صاف سی جگہ زمین پر لٹا دیا۔ اس نے ایک بار آنکھ کھولی، اس کے منہ سے ”ہر ہر مہادیو“ نکلا۔ اور ایک تاریخ ختم ہو گئی۔  
”جلدی..... کرو۔ ٹاکر ساب، جلدی کرو“ گل محمد نے رگھو ناتھ سنگھ سے کہا ”امارا رائی ساب کا مقدس جسم کوئی فرنگی نہیں چوئے پائے۔ جلدی کرو۔“

تالے کے اس پار بابا گنگا داس کی کنیا تھی۔ ان کے حکم پر ان کی کنیا تو زدی گئی، اس کی تمام لکڑیاں اکٹھا کر کے رائی کی چٹائی بنائی گئی۔ اس کے برابر ہی مندر رائی کی چٹائی بھی بنائی گئی۔ مہاتما گنگا داس نے مقدس منتر پڑھے، داسودر نے رائی کو چٹا کو آگ دی۔ پھر مندر رائی کی چٹا کو۔

اسی وقت پھر ایک فوجی دستہ اس طرف آتا نظر آیا۔ گل محمد اور رگھو ناتھ سنگھ نے رام چندر دیش کھ کو داسودر کو لے کر وہاں سے مغرب کی طرف بھیج دیا اور وہ دونوں اپنی اپنی بندوقیں لے کر درختوں کی آڑ میں ہو گئے۔

انگریزوں کے قریب آتے ہی دونوں کی بندوقیں گر بنے لگیں۔ پھر رگھو ناتھ سنگھ شہید ہو گیا۔ اب ادھر صرف کنور گل محمد تھا اور ادھر صرف ایک انگریز گل محمد نے اللہ کا نام لیا اور فار کیا۔ وہ انگریز زمین دیکھ گیا۔

کنور گل محمد درخت کے پیچھے سے نکل آیا۔ زندگی میں پہلی بار اسے حشکن کا احساس ہوا۔ اس نے بندوق تالے میں پھینک دی۔ وردی اتار کر پھاڑ ڈالی، اور رائی کی جلتی ہوئی چٹائی پھینک دی۔ اب اس کے لیے ترنگے جسم پر صرف ایک لنگوٹ رہ گیا تھا۔ اس نے آسمان کی طرف منہ اٹھایا اور اونچی آواز میں بولا۔ ”امارا سب ساتی مارا گیا۔ سب شہید ہوئے۔ امارا رائی ساب بھی شہید ہو گیا۔ خدا انگریزوں کو عارت کرے۔ اب ام نہیں لڑے گا۔ کس کا واسطے لڑے؟..... مارائی ساب چلا گیا..... رب جلیل..... امارا رائی ساب کو جنت الفردوس میں مقام عطا کرنا تو بڑا کریم ہے۔ اب ام فقیر ہے۔ ام نہیں لڑے گا۔ فرنگی مردہ باد۔ مارائی ساب پائندہ

باد..... رہے نام اللہ کا۔“

وہ جا کر رائی لکشی بائی کی جلتی ہوئی چٹا کے سامنے بیٹھ گیا اور شعلوں پر نظریں جمادیں۔ وہ وہیں بیٹھا رہا۔ شام ہو گئی۔ پھر رات ہو گئی۔ وہ وہیں لیٹ گیا، اور سو گیا۔ دوسرے دن جب وہ سو کر اٹھا تو تمام دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ چٹائیں خنڈی ہو چکی تھیں۔ بابا گنگا داس نے رگھو ناتھ سنگھ کی چٹائی ہا کر اسے بھی آگ دے دی تھی۔ وہ بھی خنڈی ہو چکی تھی۔ گل محمد نے کئی گھنٹے تک دور دور تک بکھرے ہوئے تمام چھوٹے بڑے پتھر جمع کئے اور رائی کی چٹا پر ایک چبوترہ بنا دیا۔

اسی شام تقریباً تیس انگریز فوجی ادھر سے گزرے۔ انھوں نے مردہ انگریز فوجیوں کی لاشوں کو اکٹھا کر اپنے گھوڑوں پر ڈالا۔ تبھی ان کی نظر ایک چبوترے کے نزدیک پالتی مادے بیٹھے ایک فقیر پر پڑی۔ اس کے سارے جسم پر راکھ لگی ہوئی تھی۔ ”یہ کس کا یادگار بائے؟“ ایک انگریز نے فقیر کے نزدیک جا کر پوچھا۔

”یہ امارا پیر کا درگاہ ہے۔“ فقیر نے جواب دیا۔

”ٹمارے پیر کا نام کیا تھا؟“ انگریز نے پوچھا۔

”اوائے خدا خواہ“ فقیر نے اپنی خون جھنکی سرخ آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے بڑے غصے کے ساتھ کہا۔ ”فقیر کا کوئی نام نہیں اوتا۔ ابس فقیر اوتا۔ امارا پیر بھی فقیر تا۔ بوت بوت فقیر۔ بوت اونچا۔“  
انگریز چلے گئے۔

دوسرے دن وہاں صرف وہ ”درگاہ“ رہ گئی تھی۔ فقیر گل محمد کہاں چلا گیا تھا، اور اس کا کیا انجام ہوا، یہ آج تک کسی کو معلوم نہیں۔

نہی کسی تاریخ داں، کسی محقق، کسی دانشور یا کسی دیش بھکت نے کبھی جاننے کی کوشش کی۔



## نامعقولیتیں

مزاحیہ مضامین کا مجموعہ

قیمت: =/120

## آدم زاد

اسٹی صفات پر پھیلی تائیس (شیطان) اور رانی (آدی)

کے ٹکڑوں کی کہانی۔ قیمت: =/30

## آدمی

سنسنی خیز اور چونکا دینے والے اختتام کی اٹھارہ

کہانیوں کا مجموعہ۔ قیمت: =/120

## جنگل

نئے لب و لہجے، منفرد انداز، جس سے بھرپور

تائیس افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت: =/150

## عورت

اعصاب کو جھنجھوڑنے والے اور قدم قدم پر شاک (SHOCK) دینے والے اور قطعی غیر متوقع

انجام والے اکیس افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت: =/150

## پارس (ناول)

انسانی درد سے پن کی کہانی۔ روٹنے لگے کھڑے کر دینے والا ناول جسے پڑھتے وقت قاری کا ذہن مسلسل

”پھر کیا ہوا؟“ پھر کیا ہوا؟“ کی گردان کرتا رہتا ہے، جسے ختم کئے بغیر رکھ دینا ناممکن ہے، جس کے

بارے میں تمام نقادوں کی رائے ہے کہ اردو میں آج تک ایسا ناول نہیں لکھا گیا۔ قیمت: =/120

## بستی

چونکا دینے والے انجام کی کہانیاں کا مجموعہ

قیمت: =/150

## شکیل الرحمن

تخلیقی تنقید کا منفرد دوستانہ۔ تنقیدی مطالعہ۔

قیمت: =/150

## جُب جی صاحب

گربانی پر تاثرات۔

قیمت: =/100

## لوگ

سنسنی خیز افسانوں کا مجموعہ۔

قیمت: =/150

## آخری پٹھان (ناول)

تاریخی حقائق پر مبنی سنسنی خیز کہانی

قیمت: =/150

## وحشی (ناول)

انسانی وحشی پن کی روٹنے لگے کھڑے

کر دینے والی کہانی۔ قیمت: =/150

--- زیر طبع: ---

آج-کہانیوں کا مجموعہ، ابھی-کہانیوں کا مجموعہ